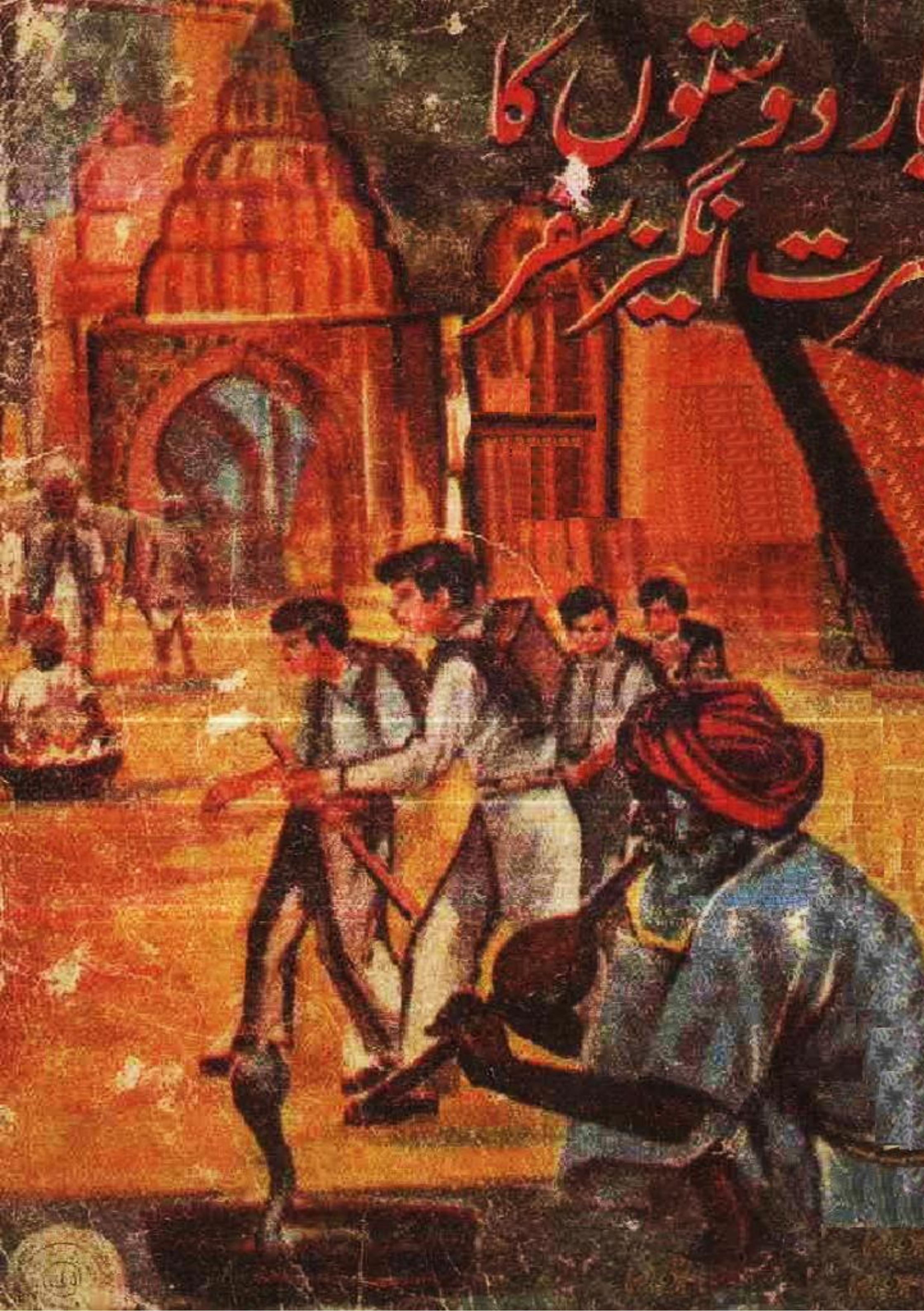

ار دوستوں کا
رت انگیز سفر

چار دوستوں کا حیرت انگیز سفر

آفتاب احمد

فہرست

پراسرار پیغام

لاہور چھاؤنی میں اکرم خان صاحب کا نشان دار بنگلہ 'گوشۂ فردوس' تھا۔ اس میں وہ اپنی بیگم اور تین بچّوں کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑا لڑکا جس کی عمر سولہ سال تھی، بے حد ذہین، صحت مند اور بہادر تھا۔ اس کا نام شاہد تھا۔ اس سے چھوٹے بھائی بہن جڑواں تھے اور ان کی عمر گیارہ گیارہ سال تھی۔

گوشۂ فردوس کے سامنے والے بنگلے میں کئی سالوں سے ایک عرب کنبہ آباد تھا۔ ان عربوں کے ساتھ والی کوٹھی میں ایرانی رہتے تھے۔ ان تینوں گھرانوں کے آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ آئے دن کسی نہ کسی کے ہاں دعوتیں اڑتیں

اور تینوں خاندانوں کے مرد عورتیں، چھوٹے بڑے جمع ہوتے۔

عرب کنبے کا لڑکا فُرسان اور ایرانی گھرانے کا لڑکا رضا، دونوں شاہد کے ہم عمر اور پکّے دوست تھے۔ رضا اور فُرسان کی سال گرہ کے موقع پر شاہد کی امّی نے انہیں شلوار اور شیروانی بنوا کر دی تھی۔

وہ پاکستانی تہواروں کے موقع پر جب انہیں پہنتے تو سبھی انہیں پاکستانی سمجھتے تھے۔ رضا بڑی روانی سے اُردُو بولتا تھا۔ فُرسان بھی اگرچہ اُردُو بول لیتا تھا لیکن وہ پ چھ ٹ ٹھ چ چھ اور ڈڑ کا تلفّظ صحیح نہیں کر سکتا تھا۔

"ٹرررن۔ ٹرررن، ٹرررن۔" ایک صبح رضا کے گھر کی گھنٹی بجی۔

"مادر۔" رضا نے ناشتے کی میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "شاہد آیا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چل گیا کہ یہ شاہد ہے؟" رضا کی امّی نے پوچھا۔

"ٹرررن کتنی دفعہ ہوئی تھی مادر؟" رضا نے پُوچھا۔

”میرے خیال میں تین بار۔“ رضا کی امّی نے کہا۔

”بالکل ٹھیک۔“ رضا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”فُرسان، شاہد اور میں نے اشارے مقرر کر رکھے ہیں۔ جب ہم میں سے کسی کے گھر کی گھنٹی تین بار ٹرررن کرے تو ہم دیکھے بغیر سمجھ لیتے ہیں یہ شاہد ہے، چار بار بجے تو فُرسان اور ایک ہی بار لمبی سی ٹرررن ہو تو میں ہوتا ہوں۔“

”تم تینوں شیطان ہو۔“ رضا کی امّی مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ٹرررن۔ ٹرررن۔ ٹرررن۔ ٹرررن۔“ دروازے پر پھر گھنٹی بجی۔

”لیکن رضا۔“ اس کی امی نے کہا۔ ”اب کے تو چار دفعہ بجی ہے۔“

”ہاں مادر۔“ رضا بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ شاہد اکیلا نہیں۔ اس کے ساتھ فُرسان بھی ہے۔“

”اُف شیطان۔“ رضا کی امّی حیرانگی سے بولیں۔ ”تم لوگ کتنے چالاک ہو۔

اشاروں میں باتیں کرتے ہو۔ دیکھے بغیر ایک دوسرے کو جان لیتے ہو۔"

پھر گھنٹی بجی لیکن اس دفعہ صرف آدھے سیکنڈ کے لیے۔"

"ہیں؟ یہ کیا؟ اب صرف چھوٹی سی ٹرن ہوئی ہے۔" رضا کی امّی نے کہا۔
"آ چھیں۔" رضا نے زور سے چھینک ماری۔

"اوہ رضا تمہیں زکام تو نہیں؟" امّی نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں مادر۔" رضا مسکراتے ہوئے بولا۔ "چھوٹی ٹرن ایک سوال ہے۔ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ میں گھر پر ہوں یا نہیں۔ میں نے چھینک کر انہیں جواب دیا ہے کہ یہیں ہوں۔ انتظار کرو۔ اب وہ انتظار کریں گے اور گھنٹی نہیں بجائیں گے۔"

"افّوہ!" رضا کی امّی پریشان سی ہو کر بولیں۔

"بیٹے، تم ایسا کیوں کرتے ہو؟"

"مادر، آپ نہیں جانتیں۔" رضا بولا۔ "ان اشاروں نے ہمیں کتنے ہی خطروں

سے بچایا ہے اور ہمیشہ مفید ثابت ہوئے ہیں۔“

اچانک پھر ایک ٹرن ہوئی۔ رضا دروازے کی طرف یہ کہتا ہوا بھاگا۔ ”وہ جلدی میں ہیں۔ تیسری ٹرن کے بعد چلے جائیں گے۔“

”رضا، انہیں اندر بُلا لو۔“ امّی نے کہا۔

”نہیں مادر، ہمیں ایک ضروری کام ہے۔ اچھا خدا حافظ۔“ رضا نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

”السلام علیکم۔“ رضا نے کوٹھی کے دروازے پر پہنچ کر فُرسان اور شاہد سے کہا۔

”وعلیکم السّلام۔“ شاہد اور فُرسان نے جواب دیا۔

شاہد بولا۔ ”اگرچہ آج موسم گرما کی پہلی چھٹی ہے لیکن میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔۔ ابھی ہمیں کیمرے کی فلم خریدنا ہے، ٹیپ ریکارڈر کے لیے نیا ٹیپ اور کراچی کے لیے سیٹیں ریزرو کرانا ہے اور۔۔۔۔“

”اور پھر بحری جہاز میں مشرقی پاکستان کے لیے سیٹیں ریزرو کرنا ہیں۔“ رضا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بحری جہاز کی سیٹیں تو ریزرو ہو چکی ہیں۔“ شاہد نے کہا۔

تینوں دوست پہلے اسٹیشن پر گئے اور سیٹیں ریزرو کرائیں اور پھر انار کلی اور شاہراہِ قائد اعظم سے چیزیں خریدیں۔ شام سے پہلے پہلے سفر کی تمام تیّاری مکمّل ہو چکی تھی۔

شاہد کے والد اکرم خان ان لوگوں میں سے تھے جن کا عقیدہ تھا کہ پڑھنا لکھنا جتنا ضروری ہے اسی قدر سیر و سیاحت ضروری ہے۔ اس موضوع پر وہ فُرسان اور رضا کے والد سے اکثر باتیں کرتے رہتے تھے اور وہ بھی قائل ہو چکے تھے کہ کتابی علم سیر و سیاحت کا بدل نہیں ہو سکتا۔

”سیر و سیاحت سے بچّوں میں ایسی خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے جو کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتی۔“

اکرم خان کہا کرتے۔ "سیاحت سے انسان کو مختلف جگہوں کو دیکھنے، وہاں کے لوگوں کے رسم ورواج اور عادتوں کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔"

یہی وجہ تھی کہ ہر سال موسمِ گرما کی چھٹیوں میں شاہد، فُرسان اور رضا کسی نئ جگہ کی سیاحت کو جاتے۔ اس سال وہ مشرقی پاکستان جارہے تھے۔ بحری جہاز میں جگہ پہلے ہی سے ریزرو کروائی جاچکی تھی۔ ادھر اکرم خان نے بھی جلد پہنچنے کے لیے تار دیا تھا اس لیے لڑکے چھٹیاں ہوتے ہی چل پڑے۔

شاہد کے والد چٹاگانگ میں تھے۔ جہاں ایک فرم کے ساتھ ان کا تجارتی لین دین تھا۔ شاہد کی امّی اور بہن بھائی ایک ہفتہ پہلے شاہد کے ماموں کے ہاں ڈھاکہ پہنچ چکے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ تینوں لڑکے اکرم خان کو چٹاگانگ میں ملیں گے اور وہاں سے یہ چاروں ڈھاکہ جائیں گے۔ پھر سب مل کر مشرقی پاکستان کی بندرگاہ کھلنا جائیں گے اور وہاں سے سندربن میں شکار کھیلیں گے۔

دوسرے دن لڑکے ٹرین میں بیٹھے تھے۔ جب گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکتی تو شاہد،

رضا اور فُرسان کو گاؤں اور شہروں کے بارے میں بتاتا۔ یہ اوکاڑہ اور یہ ساہی وال ہے۔ یہاں بڑی بڑی غلّہ منڈیاں ہیں۔ ملتان میں اونٹ کی کھال سے لیمپ شیڈ اور کئی دوسری چیزیں بنتی ہیں۔ پھر اس نے یہ شعر پڑھے:

چار چیز ست تحفۂ ملتان

گرد و گرما، گدا و گورستان

شعر سُن کے رضا کا قہقہہ نکل گیا۔ "کیا مطلب ہے اس شعر کا؟" فُرسان نے پوچھا۔

"شاعر کہتا ہے۔" شاہد بولا۔ "کہ چار چیزیں ملتان کے تحفے ہیں۔ خاک، دُھول، گرمی، بھِک منگے اور قبرستان۔" فُرسان کی ہنسی نکل گئی۔ بولا۔ "کیا یہاں بہت گرمی ہوتی ہے؟"

"ملتان کی گرمی کے بارے میں مَیں تمھیں ایک لطیفہ سناتا ہوں۔" شاہد بولا۔ "ایک فرشتہ دوزخیوں کی خبر لینے دوزخ میں گیا تو کیا دیکھتا ہے ایک دوزخی نے

کمبل لپیٹ رکھا ہے اور پھر بھی سردی سے کانپ رہا ہے۔ فرشتہ بڑا حیران ہوا اور بولا کیا تمہیں دوزخ میں سردی محسوس ہوتی ہے۔ ہاں اس آدمی نے جواب دیا۔ میں ملتان سے آیا ہوں۔"

ڈبّے میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کے بھی قہقہے چھوٹ گئے۔ پھر لطیفوں کا دور شروع ہوا اور کافی دیر یہ لوگ لطیفے کہتے رہے۔

آخر گاڑی کراچی پہنچی۔ تینوں دوست شاہد کے ماموں کے ہاں ٹھہر گئے۔ ایک ہفتے تک انہوں نے کراچی کی سیر کی۔ پھر وہ دن آیا جب وہ بحری جہاز میں اپنے کیبن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

فُرسان نے کہا۔ "ملک شام کے لوگوں کی عادت ہے کہ جب کوئی مہمان ان کے ہاں آتا ہے تو اسے چائے ضُرور پلاتے ہیں۔ چائے پی چکنے کے بعد اگر مہمان پیالے کو الٹا نہ رکھے تو وہ مہمان کے کہے بغیر اسے پھر چائے سے بھر دیتے ہیں اور مہمان کو دوبارہ چائے پینا پڑتی ہے۔ جب تک مہمان پیالے کو اُلٹا نہیں رکھتا۔

میزبان اس کے پیالے میں چائے ڈالتا رہتا ہے۔"

"یہ بھی خوب رہی۔" رضا نے کہا۔ "تم کبھی تُرکی بھی گئے ہو؟"

"نہیں۔" فُرسان نے کہا۔ "کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں ہے تو بڑی خاص بات۔" رضا بولا "میں نے کتاب میں پڑھا ہے اور ابّو سے بھی سنا ہے کہ ترکی کے جودی پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی اب تک موجود ہے۔"

"کیا ہزاروں سال گزرنے کے بعد یہ کشتی گل سڑ نہیں گئی؟" رضا نے پوچھا۔

"جودی پہاڑ پر سال کے بارہ مہینے برف جمی رہتی ہے اور جو چیز برف میں دب جائے وہ صدیوں تک تک محفوظ رہ سکتی ہے۔ یہ کشتی بھی برف تلے دبی ہوئی ہے اس لیے محفوظ ہے۔" "کاش اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔" رضا نے حسرت سے کہا۔

"تو پھر ہو جائے اگلے سال ترکی کی سیر۔" شاہد نے کہا۔

”نیکی اور پُوچ پُوچ۔“ فُرسان نے کہا۔ جس پر رضا اور شاہد ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

تینوں اگلے سال کی سیاحت کا پروگرام بنانے لگے اور رات گئے تک باتوں میں مصروف رہے۔ اس کے بعد سو گئے۔

صبح ہوئی تو غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر تینوں جہاز کے عرشے پر آ گئے۔ ارد گرد کے منتظر نہایت خوش نما تھے۔ شاہد نے بہت سی تصویریں اتاریں۔ دن اِدھر اُدھر پھرتے پھراتے گزر گیا۔ شام کے وقت تینوں دوست پھر جہاز کے عرشے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔

اُدھر ساحِل پر سے ایک شخص چپکے سے سمندر میں کودا اور آہستہ آہستہ تیرتا ہوا جہاز کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے گلے میں ایک زنجیر تھی جس کے ساتھ کوئی پیکٹ بندھا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے تیرتا ہوا جہاز پر چڑھ گیا۔

شاہد کیبن کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا۔ وہ دروازہ بند کرنے کے لیے کیبن کی طرف

گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازہ بند ہے اور بتّی جل رہی ہے۔ اس نے فُرسان اور رضا کو آواز دے کر بلایا۔ تینوں کیبن میں کھڑے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک آواز آئی۔

"غور سے سنو شاہد، بہت اہم بات ہے۔"

"یہ تو ابّو کی آواز ہے۔" شاہد ایک دم بولا۔

"ہاں سو فی صد چچا جان کی آواز ہے۔" رضا اور فُرسان بولے۔ "مگر وہ دکھائی نہیں دیتے۔"

تینوں کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ "اوہ" شاہد نے ٹیپ ریکارڈر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ آواز تو ٹیپ سے آ رہی ہے۔"

ٹیپ ریکارڈر سے پھر آواز گونجی:

"اب میں تمہیں چٹا گانگ میں نہیں مل سکوں گا۔ تُم جمعہ مسجد کے اگلے چوک

میں پہنچ جانا۔ وہاں تمہاری ملاقات ایک شخص سے ہو گی۔ جو کچھ وہ کہے اسے میرا حکم سمجھنا۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" تینوں بڑبڑائے۔

ٹیپ ریکارڈر خود بخود بند ہو گیا۔ شاہد نے دیکھا کہ ایک لمبا سا تار ریکارڈر کے ساتھ لگا ہے جو دیوار سے ہوتا ہوا جہاز کے باہر جاتا ہے۔

"غڑاپ" کسی شخص کے پانی میں کودنے کی آواز آئی۔ تینوں کھڑکی کھول کر سمندر کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک سایہ سا تیرتا ہوا ساحل کی طرف جا رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" رضا نے پوچھا۔ "کیا یہ مذاق ہے؟"

"نہیں۔" شاہد نے جواب دیا۔ "یہ ٹیپ میری نہیں۔ میری ٹیپ تو بالکل نئی ہے اور وہ سامنے پڑی ہے۔ پھر ابّو جان مجھ سے ایسا مذاق کبھی نہیں کرتے۔"

"تو پھر یہ ٹیپ یہاں کون لایا ہے؟" رضا نے پوچھا۔

"میں خود حیران ہوں۔" شاہد بولا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں۔"

تھوڑی دیر تک اس پر پُراسرار پیغام کے بارے میں تینوں سوچتے رہے۔ وہ گُم سُم تھے۔ آخر فُرسان بولا:

"تو پھر کیا کِیا جائے؟"

"جو ابّو نے حکم دیا ہے۔ اسی پر عمل کیا جائے۔" شاہد نے جواب دیا۔

جادو کا کھیل

اگلے روز تینوں لڑکے اپنے کیبن میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے کہ ایک بنگالی، جہاز کے کپتان ثاقِب مسعود کے پاس آیا اور ان کے ہاتھ میں ایک تار تھما دیا۔ ثاقِب صاحب نے تار پر پتا پڑھا اور سیدھے شاہد کے پاس گئے۔

"آپ کا تار ہے۔" ثاقِب مسعود بولے۔

شکریہ کہہ کر شاہد نے تار کے لیا اور پڑھنے لگا۔

"میں تمہیں چٹاگانگ میں نہیں مل سکوں گا۔ تم اپنے ماموں کے پاس ڈھاکے

چلے جانا۔"

تار کے نیچے اس فرم کے نمائندے کا نام تھا جس کے ساتھ اکرم خان کے تجارتی تعلقات تھے۔ لڑکے سوچ میں پڑ گئے۔ "میرے خیال میں۔" شاہد بولا۔ "ہمیں ڈھاکے جانے سے پہلے جمعہ مسجد کے چوک میں ضرور جانا چاہیے۔ کیوں کہ ان کا یہی حکم ہے، اور یہ تار ابّو کی طرف سے دیا گیا ہے لیکن بھیجنے والا کوئی اور ہے۔"

سات دن بعد جہاز چٹا گانگ کے ساحل پہ لگا۔ لڑکوں نے شاہجہاں ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لیا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر سیر کرنے نکلے۔

چٹا گانگ نہایت سرسبز پہاڑی علاقہ ہے۔ یہ مشرقی پاکستان کی بہت بڑی بندر گاہ ہے اور یہاں کئی قسم کے کارخانے ہیں۔ شاہد نے مختلف جگہوں کی تصاویر اتاریں۔

"شاب (صاحب) یاں کا دو عمارت بہّوت مشہور ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔ "ایک سلطان بایزید بسطامی کا مقبرہ اور دوسرا جمعہ مسجد۔"

جُمعہ مسجد کا نام سن کر لڑکوں کو اکرم صاحب کا پیغام یاد آیا۔

"میرے خیال میں دس بجنے والے ہیں اور اب ہمیں جمعہ مسجد کے چوک کی طرف چل دینا چاہیے۔" شاہد نے رضا اور فُرسان سے کہا۔ ٹیکسی اسی طرف چل پڑی اور وہ جمعہ مسجد کے قریب اُتر گئے۔

"میرے خیال میں۔" شاہد بولا۔ "ابّو نے جس آدمی کے بارے میں کہا ہے اسے ضرور میرا حلیہ یا کوئی نشانی بتائی ہو گی تاکہ وہ مجھے آسانی سے پہچان سکے۔"

"ڈم ڈم ڈم" اچانک ایک طرف سے ڈھول کی آواز آئی۔ جِسے ایک دبلا پتلا بنگالی لڑکا پِیٹ رہا تھا۔ اس کے گرد لڑکے بالے جمع ہو رہے تھے۔ یہ یوں بھی اسی طرف بڑھے۔ ڈھول والے لڑکے نے انہیں دیکھا تو ڈھول اور تیزی سے پیٹنے لگا۔ پھر اس نے مجمع کے گرد ایک چکر لگایا۔ رضا، فُرسان اور شاہد اب مجمع میں کھڑے تھے۔ جب وہ لڑکا ان کے قریب سے گزرا تو اس نے شاہد کو آنکھ سے اشارہ کیا اور ڈھول پر دو تین ہاتھ نہایت تیزی سے مار کر ایک طرف چل پڑا۔

تینوں لڑکے بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ان کے ساتھ اور بھی بہت سے آدمی تھے۔ تھوڑی دور ایک اور مجمع تھا۔ جس کے درمیان میں ایک لمبا سا بنگالی کھڑا جادُو کے کھیل دکھا رہا تھا۔ رضا، فُرسان، شاہد اور ڈھول والے کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔

"بچّہ لوگ تالی بجائے۔" جادُو گر نے کہا اور بچّوں نے تالیاں بجائیں۔ جادو گر نے اپنی پٹاری سے مُرلی نِکالی اور بجانے لگا۔

"جناب، آپ نے جادُو کے بہت سے کھیل دیکھے ہوں گے۔ لیکن جو کہیں آپ آج دیکھیں گے ان سے آپ کی عقل چکرا رہ جائے گی۔"

یہ کہہ کر جادُو گر نے جس کا نام عامِر تھا پٹارے سے ایک ٹب نکالی۔ پھر لوگوں کو ایک خالی ٹب دکھایا اور اس ٹب پر کپڑا ڈھانک دیا۔ اس کے بعد اس نے منتر پڑھا اور ٹب پر پھونک ماری۔ کپڑا اٹھایا تو ٹب پانی سے بھرا ہوا تھا۔ تماشائیوں نے خوشی سے تالیاں پیٹیں۔

پھر عامر جادُو گر نے پلاسٹک کی بطخ پانی پر چھوڑ دی۔ وہ بط بط بط بط کرتی ہوئی نہانے لگی۔

جادُو گر نے منتر پڑھا بطخ نے پانی میں غوطہ لگایا۔ جادُو گر نے دوسرا منتر پڑھا تو بطخ پانی سے باہر نکل آئی۔ چھوٹے بڑے سب خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ شاہد، فُرسان اور رضا بڑی دل چسپی سے کھیل دیکھ رہے تھے۔

"حضرات، اب میں آپ کو دو انڈوں کا جادُو دکھاتا ہوں۔" عامِر جادُو گر بولا۔

اس نے پٹاری سے دو انڈے نکالے۔ منتر پڑھا اور مُرلی سے دونوں انڈوں کو چوٹ لگائی۔ اِدھر انڈے ٹوٹے اُدھر دو طوطے پھڑ پھڑاتے ہوئے انڈوں میں سے نکلے اور انھوں نے اڑتے ہوئے مجمع کا چکر لگایا۔ چکر لگانے کے بعد وہ زمین پر آئے اور دوسرے سے لڑنے لگے۔ لڑتے لڑتے وہ لہولہان ہو گئے۔ عامِر جادُو گر غصّے سے دھاڑا۔

"بند کرو یہ لڑائی۔ تم میں کبھی اتفاق بھی ہو گا۔ چلو اپنے اپنے گھروں کو۔"

دونوں طوطے الگ ہو گئے اور ٹوٹے ہوئے انڈوں کے خول میں جا بیٹھے۔ انڈے خود بخود جُڑ گئے اور عامِر جادُوگر نے اٹھا کر پٹارے میں رکھ دیے۔

"حضرات، اب میں آپ کو آم کا جادُو دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر عامِر جادُوگر نے زمین میں تین لکڑیاں گاڑیں۔ ان کے درمیان زمین کھود کر آم کی ایک گٹھلی دبائی اور تینوں لکڑیوں کے گرد ایک چادر ڈال دی۔ تھوڑی دیر منتر پڑھنے کے بعد اس نے چادر ہٹائی تو لکڑیوں کے بیچوں بیچ آم کا ایک چھوٹا سا درخت اُگا ہوا تھا جس کی شاخوں پر آم لٹک رہے تھے۔ بچوں نے پھر تالیاں پیٹیں۔

"عمّار" عامِر جادُوگر نے ڈھول والے لڑکے سے کہا۔ "تم لوگوں سے پیسے اکٹھے کرو تاکہ میں جادُو کے کھیل دِکھا سکوں۔"

عمّار نے لکڑی کا پیالہ اٹھایا اور مجمع کے اندر چکر لگاتا ہوا ہر شخص کے پاس گیا۔ سبھی لوگوں نے کچھ نہ کچھ دیا۔ شاہد نے جیب سے دو روپے نکال کر اس کے پیالے میں ڈالے۔ رضا اور فُرسان نے ایک ایک روپیہ دیا۔ عمّار تینوں لڑکوں کو

دیکھ کر مسکرایا اور آنکھ سے اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ پیسے اکٹھے کرنے کے بعد اس نے پیالہ عامر جادُوگر کے حوالے کر دیا۔

سڑک پر دو آدمی جا رہے تھے جن کے پاس ایک خالی ٹوکری تھی۔ وہ بھی مجمع میں شامل ہو کر تماشا دیکھنے گئے۔

"حضرات۔" عامِر جادُوگر بولا۔ "یہ لڑکا بہت خراب ہے۔ اسکول نہیں جاتا۔ میں نے اسے زبردستی اسکول میں داخل کرایا تھا مگر یہ وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے لڑکے کو غائب کر دینا چاہیے۔"

یہ کہہ کر جادُوگر نے ٹوکریوں والے سے ٹوکری لے کر زمین پر رکھ دی۔ عمّار بھاگنے لگا تو جادُوگر نے اس کی گردن دبوچ کر ٹوکری کے اندر بٹھا دیا۔ اس نے مُرلی بجا کر کوئی منتر پڑھنا شروع کیا۔ لڑکا آنکھیں بند کیے ٹوکری میں آہستہ آہستہ نیچے ہوتا گیا۔ جادُوگر تیزی سے منتر پڑھنے لگا۔ عمّار اب ٹوکری میں لیٹ چکا تھا۔ جادُوگر نے اس کے اوپر ایک چادر ڈال دی۔

”کالی مائی، کلکتے والی، تیرا وار نہ جائے خالی۔ چھنن چھنن چھُو۔“ عامِر جادُو گر نے منتر پڑھتے ہوئے تالی بجائی اور ٹوکری پر پھُونک ماری۔ پھر چادر ہٹائی تو لڑکا ٹوکری میں سے غائب تھا۔

”ہاہاہا۔“ عامِر جادُو گر قہقہہ لگا کر بولا۔ ”جو بچّے سکول نہیں جائے۔ ان کو یہی سزا ملنی چاہیے۔ حضرات اگر آپ کو شک ہے کہ لڑکا غائب نہیں ہوا تو یہ دیکھیے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں پاؤں جوڑے اور اچھل کر ٹوکری کے اندر گر پڑا۔ لوگوں نے خُوب خُوب تالیاں پیٹیں۔

”اگر اب بھی آپ کو شک ہے تو یہ دیکھیے۔“ یہ کہہ کے جادُو گر نے پٹاری میں سے ایک تلوار نکالی اور ٹوکری میں بھونکنے لگا۔ لوگوں نے پھر تالیاں بجائیں۔

جادُو گر نے اپنی آنکھیں ملیں اور آنکھیں ملنے کے بعد جب اس کے ہاتھ نیچے ہوئے تو وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اس نے پٹاری میں سے چار شیشے کے گلاس نکالے

اور اپنے آنسو ان میں جمع کرنے لگا۔ ایک منٹ میں ہی چاروں گلاس آنسوؤں سے بھر چکے تھے۔ لوگوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

"میرا ایک ہی لڑکا تھا۔" عامِر نے روتے ہوئے کہا۔ "اب میں کیا کروں؟ ٹوکریوں والے اب تُم اپنی ٹوکری لے جاسکتے ہو۔"

لوگوں کو ہنستے دیکھ کے جادُوگر بولا۔ "حضرات، دُنیا اسی کا نام ہے۔ کوئی روتا ہے، کوئی ہنستا ہے۔ رونے سے ہنستا بہر حال بہتر ہے، تو پھر میں بھی کیوں نہ ہنسوں۔"

یہ کہہ کر وہ قہقہے مار مار کر ہنسنے لگا۔ وہ ہنستا جاتا تھا اور اس کے منہ سے پھولوں کی پتیاں نکلتی جاتی تھیں۔

"یہ ہنسنے اور رونے والا کھیل بھی خوب رہا۔" فُرسان نے رضا کے کہنی مار کر کہا۔

"بہت ہی خوب۔" رضا نے بھی فُرسان کے کہنی ماری۔

"حضرات۔" عامِر جادُوگر چیخ کر بولا۔ "بنگال کا قحط مشہور ہے۔ ایک دفعہ یہاں

قحط پڑا۔ لوگوں کو کھانے کے لیے کچھ نہیں ملتا تھا۔ ایک سادھو ہمالیہ سے نیچے اترا اور اس نے ایک صندوق میں چاول بھر کر گھر گھر پہنچائے اور یہ وہی صندوق ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک صندوق کا ڈھکن اٹھایا تو وہ چاولوں سے بھرا ہوا تھا۔ جادُوگر نے منتر پڑھا اور پھر ڈھکن اٹھایا تو چاول غائب۔

"حضرات، اب چاول آپ کی جیبوں میں پہنچ چکے ہیں۔ اپنی جیبوں کی تلاشی لیں۔ آپ بھی اپنی جیب دیکھیں۔ آپ بھی۔ آپ بھی۔"

لوگوں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں تو ایک ایک مُٹھّی چاول ان کی جیبوں میں پڑے ہوئے تھے۔ مجمع نے زور دار تالیاں پیٹیں۔

شاہد کی جیب میں بھی چاول تھے لیکن چاولوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ جس پر لکھا تھا:

"شاہد، تم ٹوکری والے ان دونوں آدمیوں کے پیچھے جاؤ۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ کسی کو بھی پتا نہ چلے کہ تم کہاں جا رہے ہو۔"

شاہد نے جلدی سے رقعہ جیب میں ڈال لیا۔ ٹوکری والے مجمع میں سے باہر نکل گئے تھے۔ شاہد اور اس کے ساتھی بھی خاموشی سے باہر نکل آئے۔

ٹوکری والے آہستہ آہستہ ایک طرف جا رہے تھے جیسے وہ انتظار کر رہے ہوں کہ شاہد رقعہ پڑھنے کے بعد آگے بڑھے تو وہ تیزی سے چلیں۔

"تم دونوں یہیں کہیں ٹھہرنا۔" شاہد نے فُرسان اور رضا سے چُپکے سے کہا۔ "میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔"

اب شاہد ٹوکری والے دونوں آدمیوں کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔

نایاب ہیرا

ٹوکری والے دونوں آدمی چلتے چلتے ایک تنگ سی گلی کی طرف مڑ گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ دائیں بائیں پھر دو موڑ مرنے کے بعد انہوں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ شاہد بھی اسی تیزی کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹا چلنے اور مختلف موڑ مرنے کے بعد ایک میدان نظر آیا جس کے اندر ایک بہت بڑا قلعہ نما مکان بنا ہوا تھا۔ اس کے دروازے پر لکھا تھا۔

حاجی شمس الحق اینڈ کمپنی

دونوں آدمی اس مکان کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ شاہد ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ اچانک دھم کی آواز آئی اور لوہے کا ایک دروازہ گرا جس سے وہ راستہ بند ہو گیا جس سے شاہد اور وہ دونوں آدمی اندر داخل ہوئے تھے۔ شاہد نے گردن گھما کر پیچھے کی جانب دیکھا تو دھم کی دوسری آواز آئی اور شاہد کے سامنے ایک اور لوہے کا دروازہ گرا اور آگے کا راستہ بھی بند ہو گیا۔ اب وہ چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔

"یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" وہ گھبرا گیا تھا۔

اچانک اسے دائیں طرف والی دیوار میں ایک چھوٹا سا راستہ نظر آیا۔ وہ تیزی سے اس طرف بڑھا۔ راستہ پار کرنے کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ ایک ہال میں کھڑا ہے۔ اس کے سامنے قراقلی ٹوپی پہنے ایک ٹھنگنا سا آدمی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"میرا نام حاجی شمس الحق ہے۔ تم صحیح وقت پر پہنچے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

وہ آدمی بولا۔

شاہد پریشان سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں جلد ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ابھی اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ تمہارے والد میرے عزیز دوست ہیں۔ اور ان سے میرے تجارتی تعلقات ہیں۔" حاجی شمس الحق نے کہا۔

اچانک ایک بوڑھا آدمی وہاں آ گیا۔ شمس الحق بولا۔ "یہ میرا چوکیدار کمال ہے۔ دروازے اسی نے بند کیے تھے۔ کمال، اب تم جا سکتے ہو۔"

کمال چلا گیا تو حاجی شمس الحق نے شاہد کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

وہ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں کُرسیوں اور میزوں کی ایک لمبی سی قطار لگی ہوئی تھی۔

"یہ میری فرم کے کلرکوں کا کمرہ ہے۔" شمس الحق بولا۔ اس وقت وہ کھانا کھانے

گئے ہوئے ہیں اس لیے ان کو پتا نہ چل سکے گا کہ تم یہاں آئے ہو۔"

شاہد کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس کے حق میں اچھا ہو رہا ہے یا برا۔ اسے تھوڑا سا خوف محسوس ہوا تو اُس نے دل میں دُعا مانگی اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اگر کسی نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ بھی مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔

"بیٹھو، اس کرسی پر۔" شمس الحق نے اسے اشارہ کیا۔ شاہد بیٹھ گیا۔ شمس الحق کے قریب ایک تھرموس پڑی تھی۔ اس نے دو گلاس شربت کے بھرے اور ایک شاہد کو دیا اور دوسرا خُود لے لیا۔ شاہد نے ہچکچاتے ہوئے گلاس ہاتھ میں

لے لیا۔ اور کرسی کے بازو پر رکھ دیا۔ شمس الحق آدھا شربت پی چکا تھا لیکن شاہد نے سخت پیاس کے باوجود ابھی تک چکھا تک نہیں تھا۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" شمس الحق مسکرا کر بولا۔ "تم میرے عزیز دوست کے بیٹے ہو۔ بِلا کھٹکے پیو۔" شاہد آہستہ آہستہ شربت پینے لگا۔

"شاہد بیٹا۔" شمس الحق نے شربت پینے کے بعد کہا۔ "اس وقت حالات ہی کچھ اس قسم کے ہیں کہ میں تمہیں شربت کے علاوہ کچھ پیش نہ کر سکا۔ انشاء اللہ کسی آیندہ ملاقات میں سب کسر نکال دوں گا۔ اب جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔"

دونوں مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ایک شان دار کمرے میں آ گئے۔

"یہ میرے دفتر کا کمرہ ہے۔" شمس الحق نے کہا۔ "یہاں بیٹھ جاؤ، اس کرسی پر۔" یہ کہہ کر اس نے ایک الماری کا تالا کھولا اور اس میں سے ایک ڈبّا نکالا جس کے گِرد ریشمی کپڑا لپٹا ہوا تھا۔

"تم نے بحری جہاز میں اپنے والد صاحب کا پیغام وصُول کیا تھا۔ وہ چٹا گانگ سے جا چکے ہیں۔ ان کی ایک امانت ہے جو مجھے ان تک پہنچانا ہے اور اس کام کے لیے تم بہترین آدمی ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے ریشمی غلاف اُتارا اور ڈبّے میں سے خون کی طرح سُرخ رنگ کا ایک لعل نِکالا۔ یہ لعل بطخ کے انڈے سے بڑا تھا۔ شمس الحق نے لعل میز پر رکھ

دیا۔ اس میں سے نکلنے والی شعاعوں نے سارے کمرے کو سُرخ کر دیا تھا۔ شاہد اس سے پہلے بہت سے ہیرے دیکھ چُکا تھا مگر اتنے بڑے سائز کا اور اتنا خوب صورت ہیرا اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"یہ لعل تمہیں اکرم خان صاحب کے پاس پہنچانا ہے۔" شمس الحق نے کہا۔ "جس شخص کے پاس یہ لعل ہو گا وہ بے شمار دشمنوں میں بھی خوف محسوس نہیں کرے گا۔ میں تمہیں اس کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتاتا ہوں۔ اس لعل کا نام "نورِ لاما" ہے۔ لاما تبّت کے پیشواؤں کا نام ہے۔ اس جیسا قیمتی لعل دنیا میں کسی کے پاس نہیں۔ یہ لعل تبّت کے بڑے لاما نے ہندوستان کے ایک راجا کو تحفے میں دیا تھا۔ اس کی برکت سے راجا نے اپنے دشمنوں پر فتح پائی اور اس کے ملک میں ایک سونے کی کان بھی دریافت ہوئی جس سے وہ مالا مال ہو گیا۔ راجا نے مرتے وقت اپنے وارثوں کو یہ وصیّت کی تھی کہ اگر کبھی وہ کنگال ہو جائیں اور انہیں سونے کی کان اور دوسری چیزیں بیچنے کی ضرورت پڑے تو یہ لعل کبھی نہ بیچیں بلکہ اسے واپس تبّت کے بڑے لاما کے وارثوں کو پہنچا دیں۔ کچھ عرصہ پہلے

اس راجا کے وارثوں نے سونے کی کان اور دوسری قیمتی چیزیں بیچ دیں اور راجا کی وصیّت کے خلاف اس لعل کا سودا بھی کر لیا۔ مگر راجا کے چند وفادار ملازموں نے تمہارے والد کو دے دیا کہ اسے تبّت کے لاما کو پہنچا دیں۔ تمہارے والد کے راجا کے خاندان سے بہت اچھے تعلقات ہیں اور وہ وہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ لعل لے کر تبّت گئے تو معلوم ہوا کہ یہ اصل نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے ایک دوست قاسم کو لعل کی تلاش میں لگا دیا۔ اسے پتا چلا کہ یہ لعل میرے میرے پاس ہے۔ وہ میرے پاس آیا مگر میں اس سے نہ مل سکا کیونکہ میں باہر گیا ہوا تھا۔"

"یہ قاسم صاحب کہاں ہیں؟" شاہد نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ البتّہ ان کا گھر یہاں سے پینتیس میل دُور کپتائی میں کسی جگہ ہے۔" شمس الحق نے جواب دیا۔

"ابّو کہاں ہیں؟" شاہد نے پوچھا۔

”میرے خیال میں وہ بڑے لاما کے پاس ہیں اور وہ انہیں وہاں سے اس وقت تک نہیں آنے دے گا جب تک اسے یہ لعل نہ مل جائے۔“ یہ سن کر شاہد بہت گھبر ایا اور بولا۔ ”تو اس کا مطلب ہے کہ لاما نے میرے والد کو قید کر رکھا ہے۔“

”یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے وہ تبّت کے بجائے یہیں کہیں ہوں۔“

”ان کا پتا کس سے چل سکتا ہے؟“ شاہد نے پوچھا۔

”قاسم صاحب سے۔“ شمس الحق نے کہا۔

”میں اس لعل کو اپنے ابّو کے پاس ضرور پہنچاؤں گا، چاہے میری جان ہی چلی جائے۔“ شاہد نے کہا۔

”ضرور ضرور۔“ شمس الحق مسکرا کر بولا۔ ”یہ رہا لعل۔ اب تمہیں بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہے کیونکہ لاما کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر کالی دیوی کے مندر کے پجاری۔ ان پجاریوں کا خیال ہے کہ یہ لعل کالی دیوی کی مورتی میں لگا ہوا تھا اور تبّت کا لاما کسی طرح اسے یہاں

سے لے گیا تھا۔ یہ پجاری بہت خطرناک ہیں اور وہ اس لعل کے پیچھے تمہاری جان لینے سے بھی نہیں ہچکچائیں گے۔ لیکن تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جس کے پاس یہ لعل ہو گا اسے بڑے سے بڑا دشمن بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

یہ کہہ کر اس نے لعل شاہد کے ہاتھ میں دے دیا۔

اچانک قریب ہی مکھّیوں کی سی بھنبھناہٹ سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ اونچی ہوتی گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سینکڑوں آدمی دنگے فساد میں مصروف ہیں۔

"یہ آواز کیسی ہے؟" شاہد نے لعل کو غلاف میں بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

شمس الحق کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ وہ بولا۔ "پجاری آن پہنچے ہیں۔ وہ اس لعل کی تلاش میں جگہ جگہ پھر رہے ہیں۔ ہوشیار۔" اب چیخوں اور گولیوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"مالک، خطرہ۔ پجاری آہنی دروازہ توڑ کر یہاں آ چکے ہیں۔" کمال کی آواز آئی۔

یہ سن کر شمس الحق کھڑا ہو گیا۔ اور شاہد سے بولا۔ ”میں چلتا ہوں۔ تم اس گودام میں چھپ جاؤ۔ جلدی کرو۔“

یہ کہہ کر شمس الحق باہر نکل گیا۔ شاہد تیزی سے گودام میں پہنچا جہاں پھلوں کے کریٹ اور خالی ٹوکریاں پڑی تھیں۔ اچانک اندھیرے میں اس نے عمّار کو دیکھا۔

”جو میں کہوں ویسا ہی کرو۔“ عمّار نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گودام کے ایک کونے میں لے گیا۔

کپتائی میں

پجاری اب تہہ خانے میں پھر رہے تھے۔ وہ شمس الحق کی تلاش میں تھے۔ عمّار نے پجاریوں کے تہہ خانے میں پہنچنے سے قبل ہی شاید کو ایک چھوٹے سے خالی کریٹ میں چھپا کر اس کے اوپر دوسرے کریٹ رکھ دیے تھے۔ پھر اس نے شاہد کو سمجھایا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے آواز سننے ہر گز کریٹ سے باہر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ اس کے بعد اس نے دوسرے کونے میں پڑی ٹوکریوں کے ایک ڈھیر میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں شاہد کو اپنی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کریٹ میں اس

بری طرح پھنس گیا تھا کہ ذرا بھی نہیں ہِل سکتا تھا۔ اس کی ٹانگیں سو گئی تھیں اور سارے جسم میں درد ہونے لگا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ اور پھر اچانک آگ آگ کا شور بلند ہوا۔ آگ تہہ خانے کی سیڑھیوں تک پہنچ چکی تھی اور اس کے شعلے کریٹوں کو چھو رہے تھے شاہد کو بھی ہلکی ہلکی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلنا چاہی لیکن یہ ناممکن تھا۔ وہ کریٹ میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ آگ اب بہت قریب آ چکی تھی۔ اس نے بہتیرا زور لگایا مگر آزاد نہ ہو سکا۔ وہ دل ہی دل میں عمّار کو کوسنے لگا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ دو تین منٹ بعد وہ جل کر کوئلہ ہو جائے گا اور کوئی اس کی شناخت بھی نہ کر سکے گا۔ دھوئیں سے اسے دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ فضاؤں میں تیر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایک چھوٹے کمرے میں چارپائی پر پڑا پایا۔ اس کے چہرے پر پانی کے قطرے تھے اور پاس ہی

عمّار بیٹھا پنکھا جھل رہا تھا۔ عمّار کو دیکھ کر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ عمّار کے دل پر چرکا سا لگا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔

"میں کہاں ہوں؟" شاہد نے عمّار سے پوچھا۔ "مجھے کون یہاں لایا ہے؟"

عمّار بولا۔ "بات یہ ہوئی تھی شاہد بابُو کہ میں تہہ خانے سے پجاریوں کے جانے کا انتظار کر رہا تھا مگر وہ جانے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ مجھے آپ کی تکلیف کا پورا احساس تھا مگر کیا کرتا، مجبور تھا۔ ایک پجاری نے بنگالی زبان میں دوسرے سے کہا کہ اس نے تمھیں تہہ خانے میں جاتے دیکھا ہے۔ کافی دیر تک ڈھونڈنے کے بعد وہ خود تو باہر چلے گئے تھے۔ مگر ایک آدمی کو تہہ خانے کا پہرہ دینے کے لیے چھوڑ گئے۔ اتنے میں شور اٹھا کہ پولیس آگئی ہے۔ پجاریوں اور پولیس کے درمیان فائرنگ شروع ہو گئی اور بہت سے پجاری ہلاک ہو گئے اور جو باقی بچے بھاگ گئے۔ مگر بھاگتے بھاگتے انہوں نے جگہ جگہ آگ لگا دی۔ اب میں فوراً ٹوکری سے نکلا اور تہہ خانے سے نکل کر دفتر میں پہنچا۔ وہاں میں نے فائر بریگیڈ کو فون کر دیا اور

تھوڑی ہی دیر میں وہ یہاں پہنچ گئے۔ میں فائر بریگیڈ کو سب سے پہلے تہہ خانے میں لایا اور آگ بجھوائی۔ اگر ایک دو منٹ اور دیر ہو جاتی تو آپ جل کر بھسم ہو چکے ہوتے۔"

شاہد کو یہ سن کر ندامت ہوئی اور اس نے عمّار سے معافی چاہی۔

"شاہد۔" عمّار بولا۔ "ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ آپ یہاں سے چلنے کی تیاری کریں۔ اگرچہ پجاری یہاں سے جا چکے ہیں لیکن وہ دوبارہ بھی آسکتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ ہم کپتائی میں اپنے ماموں قاسم کے پاس چلیں۔ ان کی تمہارے والد کے ساتھ بہت دوستی ہے اور وہ بڑے ہوشیار آدمی ہیں۔ تمہارے والد کے بارے میں بھی انہی سے پتا چل سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" قاسم کا نام سن کر شاہد چونکا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"لیکن اس حالت میں نہیں۔ تمہیں پٹھان کا بھیس بدل کر چلنا ہو گا۔ ذرا ٹھہرو۔ میں ڈرائیور کے کپڑے لاتا ہوں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد شاہد شلوار قمیص اور سر پر پگڑی رکھ کر آئینے میں اپنی شکل دیکھ رہا تھا۔ نقلی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے سینہ تان کر کہا۔ ”اخُّو! ووئے خدا کا قسم اب تو ام خُود کو نہیں پہچان سکتا۔“

عمّار کی ہنسی نکل گئی۔ بولا ”شاہد گُل اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے پولیس آ جائے اور ہمیں گواہی میں دھر لے۔“

دونوں وہاں سے چُپکے سے نکلے اور مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے جمعہ مسجد کے اسی چوک میں پہنچ گئے جہاں رضا اور فُرسان کو چھوڑا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھے۔ انہوں نے ٹیکسی لی اور شاہجہاں ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں رضا اور فُرسان بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ وہ جلدی سے انہیں تیّار کروا کر لاریوں کے اڈّے پر پہنچے۔ کپتائی جانے والی ایک لاری تیار کھڑی تھی۔ یہ جلدی سے اس میں سوار ہوئے اور اِرد گرد کے نظّاروں سے لطف لیتے ہوئے کپتائی پہنچ گئے۔

کپتائی کے بارے میں عمّار نے بتایا۔ ”کپتائی چٹا گانگ سے ۳۵ میل کے فاصلے پر

ہے۔ یہاں حکومتِ پاکستان نے ایک بہت بڑی جھیل بنوائی ہے۔ اس جھیل سے مچھیرے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ کچھ شوقین لوگ مُرغابیوں کا شکار کھیلنے بھی آتے ہیں۔ بعض وقت کوئی شیر بھی اِدھر آنکلتا ہے۔"

عمّار کو دیکھ کر اس کی ممانی اور اس کے بے شمار بچّوں نے شور مچانا اور اچھلنا کودنا شروع دیا۔ چاروں لڑکے بیٹھک میں بیٹھے تھے اور کمرہ مختلف عمر کے بچّے بچّیوں سے بھرا ہوا تھا۔

"یہ سب کون ہیں؟" شاہد نے پوچھا۔

عمّار کی ہنسی نکل گئی۔ بولا۔ "یہ سب میرے ماموں زاد بہن بھائی ہیں۔"

"ان کی تعداد ماشاء اللہ کتنی ہے؟" فُرسان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"چھ لڑکیاں اور سات لڑکے۔ ایک لڑکا کپتائی سے باہر ہے۔ تین بچّے مر چکے ہیں۔" عمّار نے جواب دیا۔

"استغفر اللہ۔" رضا نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کیا۔

"ماشاء اللہ کہو، ماشاء اللہ۔" شاہد بولا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں، عمّار بولا" بنگالی گھرانوں میں اکثر اس سے زیادہ بچّے ہوتے ہیں۔ میری ممانی کو تو بچّوں کے کم ہونے کا افسوس ہے۔"

اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ بچّے ایک دم خاموش ہو کر ان کا منہ تکنے لگے۔ دراصل اس گھرانے میں سوائے ایک لڑکی اور دو بڑے بچّوں کے کوئی بھی اُردُو نہیں سمجھتا تھا۔ یہ لڑکی بھی ابھی باہر ہی تھی۔ عمّار بنگلہ زبان میں اپنی ممانی سے باتیں کرنے لگا۔ پھر افسوس کے لہجے میں تینوں لڑکوں سے بولا۔ "قاسم ماموں کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ کل یہاں آئے تھے اور تھوڑی دیر ٹھہر کر واپس چٹاگانگ چلے گئے۔ ہم تھوڑی دیر یہاں آرام کرتے ہیں۔ پھر چٹاگانگ چلے جائیں گے۔"

اچانک انہیں گنگنانے کی آواز آئی۔ کوئی لڑکی نہایت سریلی آواز میں بنگالی کے

مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام کے شعر گا رہی تھی۔ اگرچہ عمّار کے سوا کسی کی سمجھ میں شعر نہ آئے لیکن اس کی آواز اتنی سُریلی تھی کہ سب ہی جھوم اٹھے۔ لڑکی گنگناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو اتنے لڑکوں کو دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی اور پھر واپس جانے کے لیے مُڑی۔

''شہلا۔'' عمّار کی ممانی بولی اور بنگالی میں اس کچھ کہنے لگی۔ شہلا شرماتی ہوئی کمرے میں آئی اور ''آداب عرض'' کہہ کر لڑکوں کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

لڑکی کے بال کھلے ہوئے تھے اور گلے میں موتیا کے پھولوں کا ہار تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی ساڑھی اور ہاتھوں میں موتیے کے گجرے پہن رکھے تھے۔

شاہد نے عمّار کو ہولے سے کہنی مار کر کہا۔ ''اس لڑکی کا رنگ اتنا سُرخ و سفید ہے کہ بنگالی معلوم ہی نہیں ہوتی۔''

عمّار لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''تو پھر کون معلوم ہوتی ہے۔''

''اگر اس نے بنگالی لباس نہ پہنا ہوتا تو میں اسے ایرانی لڑکی سمجھتا۔'' رضا بولا۔

عمّار اور لڑکی دونوں مسکراتے رہے۔

"میرے خیال میں۔" شاہد بولا۔ "یہ ایرانی ہے نہ عرب بلکہ کشمیری معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاہاہا" عمّار اور شہلا کا قہقہہ نِکل گیا۔ شاہد کچھ پریشان سا ہوکر انہیں دیکھنے لگا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔" عمّار بولا۔ "یہ دراصل کشمیری ہی ہے۔ میرے ماموں کی پہلی بیوی کشمیرن تھی۔ اور یہ انہی پہلی بیگم کی اکلوتی اولاد ہے۔ جب اس بیوی کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے ایک بنگالی گھرانے میں شادی کرلی۔"

"آپ کی امّی کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا۔" رضا افسوس کرتے ہوئے بولا۔

شہلا ایک دم پیلی پڑگئی۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"رضا۔" عمّار بولا۔ "تم نے غلطی کی جو شہلا کو اس کی امّی کی یاد دلائی۔ یہ بہت ہی

حساس لڑکی ہے۔ اسے اپنی ماں کبھی نہیں بھولتی۔ جس کا کوئی عزیز مر چکا ہو اس کے سامنے کا کبھی ذکر نہیں کرنا چاہیے۔"

"مجھے افسوس ہے۔" رضا نے پریشان ہو کر کہا۔

کمرے میں مکمّل خاموشی چھا چکی تھی۔ عمّار کی ممانی نے بنگالی میں عمّار سے چند باتیں کیں اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ شہلا کو واپس ان کے پاس لے آئیں۔ رونے سے شہلا کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور لڑکوں کو بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ عمّار کی مُمانی نے عمّار سے چند باتیں کیں اور اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ پھر اشارے سے عمّار نے دوسرے تمام بچّوں کو بھی کمرے سے باہر جانے

کے لیے کہا۔ اب چاروں لڑکے شہلا کو خوش کرنے کے لیے باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں شہلا کھُل گئی اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ اسے خوش دیکھ کر سب کو اطمینان ہوا۔

"شاہد" عمّار بولا۔ "اب میں تمھیں دو مزے دار باتیں بتاؤں۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک ہاتھ میں ستار اور دوسرے میں ایک تصویر لیے کمرے میں داخل ہوا۔

"شہلا کی آواز اتنی سُریلی ہے کہ لوگ اسے بُلبُل کہتے ہیں۔" عمّار بولا۔ "اگر آپ چاہیں تو آپ کو بہت سی زبانوں کے گیت سنا سکتی۔"

تینوں لڑکوں نے فرمائش کی تو شہلا مان گئی اور اس نے اُردُو اور بنگالی کے گانے سنائے۔ رضا کے لیے اس نے خیام کی رباعیاں سنائیں اور فُرسان کے لیے مشہور عرب شاعر ابو نواس کے شعر گائے۔ سب نے شہلا کی آواز کی بہت تعریف کی۔

"میں نے دیکھا ہے کہ بنگال کے لوگ گانے بجانے کے بہت شوقین ہیں۔" شاہد نے کہا۔

"بنگال رسیلے گیتوں کا دیس ہے۔ یہاں ہر شخص گاتا ہے؟" عمّار بولا۔ "اچھا اب

یہ تصویر دیکھو اور بتاؤ یہ کون ہے؟"

اس نے لڑکوں کو ایک تصویر دکھائی۔ تصویر میں ایک خوش رنگ لڑکا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس نے ایک قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ لڑکے پہچان نہ سکے۔

شہلا مسکرا کر بولی۔ "یہ صاحب حاجی شمس الحق کی فرم میں ملازم ہیں اور ان کو دو شوق ہیں۔ اداکاری کا اور جاسوسی کا۔"

شاہد اچانک چونک کر بولا۔ "ارے! عمّار تم؟"

عمّار ہنس کر بولا۔ "جی جناب۔ یہ تصویر اس وقت کی ہے جب میں نے میٹرک کے امتحان میں صوبے بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔"

"لیکن تم نے یہ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟" شاہد نے پوچھا۔

"فرض کی ادائیگی میں حلیے کا خیال نہیں کرنا چاہیے۔" عمّار سنجیدگی سے بولا۔ "میری فرم کے مالک نے یہ کام عامر چچا اور میرے سپرد کیا تھا کہ میں لعل کو

پجاریوں سے بچا کر تمہارے والد کے پاس پہنچانے میں تمہاری مدد کروں۔ سو یہ سب کچھ کرنا پڑا۔"

"تو کیا عامِر جادُوگر تمہارے والد نہیں ہیں؟" فُرسان نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، البتّہ میرے والد ان کے بچپن کے گہرے دوست تھے۔ دونوں نے قسم کھا کر ایک دوسرے کا ہمیشہ کے لیے بھائی بننے کا عہد کیا تھا۔ میرے والد وفات پا گئے تو وہ مجھے اپنے ہاں لے گئے۔ مجھے تعلیم بھی انہوں ہی نے دلوائی ہے۔" عمّار بولا۔

بُوڑھا داستان گو

چاروں لڑکے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں دروازے پر ایک سفید ڈاڑھی والا بُوڑھا دکھائی دِکھائی دیا۔

"السّلام علیکم سجاد بابا۔" عمّار کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر تینوں لڑکوں نے بھی سلام کیا اور کھڑے ہو گئے۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھو بیٹھو۔" بزرگ نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عمّار نے تینوں لڑکوں کا تعارف کرایا اور بولا۔ "یہ عامِر چچا کے والد ہیں۔ یہاں

کے لوگ انہیں بابا داستان گو کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ سجّاد بابا کو بہت سی داستانیں یاد ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بابا شعر و شاعری، محاورے، کہاوت اور کہانیوں کے حوالے سے باتیں کرنے کے عادی ہیں۔"

"سچّی بات پوچھو تو کہوں۔" سجاد بابا بولے۔ "یہ عیب مجھ میں ہی نہیں ہماری قوم کے اکثر لوگوں میں ہے۔ سیدھی بات نہ تو لوگوں کو پسند ہے اور نہ وہ ایسی باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ ہم لوگ قصّے کہانیاں، اپنی زندگی کے واقعات اور تجربے سُننے اور سنانے کے اتنے شوقین ہو چکے ہیں کہ اکثر لوگ صرف اسی چیز کی خاطر روزانہ ہوٹلوں، ریستورانوں اور عزیز رشتہ داروں کے ہاں جاتے ہیں۔ خاموشی کے ساتھ مسلسل فرض کی ادائیگی اور عمل کرنے کی ہمیں نہ خُود عادت ہے اور نہ کسی میں یہ عادت دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں تو بس دن رات قصّے کہانیاں اور داستانیں چاہیں۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شہلا اور عمّار کی ممانی کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے زمین پر دری بچھائی اور پھر کھانا لگا دیا۔ لڑکے اور بابا داستان گو دری پر

بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ گرم گرم چاولوں کے ساتھ مچھلی نے عجیب مزہ دیا۔

"ہمارے لوگ ماچھلی کو گنگا پھل بولتا۔" عمّار کی مُمانی نے زندگی میں شاہد پہلی مرتبہ اُردُو بولتے ہوئے کہا۔

"ماچھلی کیا؟" رضا نے پوچھا۔

"مچھلی، جسے فارسی میں ماہی اور عربی میں حُوت کہتے ہیں۔" بابا داستان گو نے کہا۔

اب اندھیرا کافی ہو چکا تھا اور لڑکے کچھ کچھ تھکن محسوس کر رہے تھے۔ عمّار نے پوچھا کہ وہ واپس چٹاگانگ جانا چاہتے ہیں یا رات کو یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ رضا، فُرسان اور شاہد ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی کا بھی جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش رہتے۔ عمّار سمجھ گیا اور بنگالی میں اپنی مُمانی سے باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی بعد بولا۔ "آج رات ہم یہیں رہیں گے اور سجّاد بابا ہمیں کہانیاں سنائیں گے۔"

یہ سُن کر تینوں لڑکوں کو بہت خوشی ہوئی۔ "لیکن۔" شاہد نے کہا۔ "ابھی تو سجّاد

بابانے داستانوں اور قصّے کہانیوں کی برائی کی تھی پھر یہ راضی کیسے ہو گئے۔"

"یہی تو اصل بیماری ہے۔" بابا داستان گو بولے۔ "ہر داستان گو کے پاس تجربوں اور دانائی کی باتوں کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ لیکن ان پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ داستان گوئی کو ناپسند کرتا ہوں ورنہ داستانیں بجائے خود نہ صرف یہ کہ بُری چیز نہیں بلکہ تعلیم و تربیت کا بہت عمدہ ذریعہ ہیں۔"

"بابا بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" شاہد نے کہا۔ دوسرے لڑکوں نے بھی سر ہلا کے ہاں کہا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے میں بستر بچھا دیے گئے۔ لڑکے اپنے اپنے بستروں میں گھس گئے۔ بابا داستان گو ان کے درمیان بیٹھے داستان سنانے لگے۔

"کسی شہر میں ندیم اور فاروق دو دوست رہتے تھے۔ ان کے گھر ایک ہی محلّے میں تھے۔ دونوں ایک ہی سکول میں اور ایک جماعت میں پڑھتے تھے۔ ندیم کی عمر نو سال کی تھی اور فاروق اس سے ایک سال بڑا تھا۔ دونوں بڑے پکے دوست

تھے۔ اکٹھے ہی سکول جاتے اور چھٹی ملنے پر اکٹھے ہی گھر لوٹتے۔ ندیم میں ایک خوبی ایسی تھی جس کی وجہ سے اس کے تمام دوست، رشتے دار اور استاد اسے بے حد پسند کرتے تھے۔ وہ خوبی یہ تھی کہ اسے جب بھی کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا وہ دوسرے بچوں کی طرح ہمّت ہار کر بیٹھ نہیں جاتا تھا۔ بلکہ اس مشکل کو ختم کرنے کے لیے غور و فکر کرنا شروع کر دیتا اور اس وقت تک سوچ بچار کرتا رہتا جب تک اسے نجات پانے کا کوئی طریقہ نہیں معلوم ہو جاتا تھا۔

اسی خوبی کی بنا پر وہ آیندہ چل کر ایک اہم انسان بن گیا۔ اس کے بچپن کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دن وہ فاروق کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ دونوں کو پیاس لگی تھی۔ اتنے میں انہوں نے کیا دیکھا کہ دو آدمی، لمبی لمبی مونچھوں والے، گھوڑوں پر سوار ان کی طرف آ رہے ہیں۔ جب پاس پہنچے تو ایک گھڑ سوار ان سے کہنے لگا۔ ”دھوپ تیز ہے۔ تُم تھکے ہوئے اور پیاسے معلوم ہوتے ہو۔ آؤ ہمارے گھوڑوں پر چڑھ جاؤ۔ ہم تمہیں گھر چھوڑ آتے ہیں۔“

فاروق سیدھا سادا لڑکا تھا فوراً مان گیا اور ندیم سے کہنے لگا۔ ”یہ اجنبی کتنے اچھے

ہیں آج تو سیر کا لطف آ جائے گا۔"

ندیم نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"نا بابا نا۔ میرے ابّا اور امّی نے مجھے نصیحت کی ہے کہ سڑک پر کبھی کسی اجنبی سے بات نہیں کرنا چاہیے۔"

فاروق نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "واہ بھئی واہ۔ دیکھ لی تمہاری بہادری۔ بھئی وہ بھی تو ہماری طرح کے انسان ہیں۔ کھا تو نہیں جائیں گے۔ لو میں تو چلا۔"

بزدلی کا طعنہ سن کر ندیم اس کی باتوں میں آ گیا اور گھوڑے پر چڑھ گیا۔ یہ دونوں گھُڑسوار دراصل دو بردہ فروش تھے۔"

"بردہ فروش کسے کہتے ہیں بابا؟"فُرسان نے پوچھا۔

"یہ وہ لوگ ہوتے ہیں۔" بابا داستان گو بولا۔ "جو شہروں میں جا کر بچوں کو بہلا پھسلا کر اغوا کر لیتے ہیں اور پھر انہیں دور لے جا کر فروخت کر دیتے ہیں۔ تو ہوا

یوں کہ جونہی ندیم اور فاروق گھوڑوں پر بیٹھے، دونوں بردہ فروشوں نے ان پر کمبل ڈال کر اچھی طرح جکڑ لیا اور گھوڑے سرپٹ دوڑا دیے۔ شام کے وقت یہ بردہ فروش ایک غار میں داخل ہوئے۔ کیونکہ یہ ان کا گھر تھا۔ انہوں نے فاروق اور ندیم کو زنجیروں میں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ پھر انہوں نے غار کے اندر آگ جلائی اور گوشت بھُون بھُون کر کھانے لگے۔"

ایک بُردہ فروش نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "چار روز کے بعد ہم سرحد پار کے شہر میں ان دونوں کو بیچ دیں گے۔"

یہ سن کر فاروق تو لگا دہاڑیں مار مار کر رونے مگر ندیم نے اپنی عادت کے مطابق سوچنا شروع کر دیا کہ اس مصیبت سے چھٹکارا کیسے حاصل ہو۔ وہ رات بھر سوچتا رہا اور فاروق رات بھر روتا رہا۔

صبح ہوئی تو بردہ فروش ان کو غار میں چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ شام کو لوٹ کر آئے تو ان کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی تھا، جس کا نام جاوید تھا۔ انہوں نے جاوید کو بھی

ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیر ڈال کر تالا لگا دیا۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مگر غار کے اندر گرمی تھی۔ دونوں بردہ فروشوں نے آگ جلائی اور گوشت بھُون بھون کر کھانے لگے۔ گرمی اتنی بڑھی کہ انہوں نے قمیصیں اُتار دیں۔

ادھر جاوید بھی فاروق جیسا لڑکا نکلا۔ اس کو روتے دیکھ کر وہ بھی زار و قطار رونے لگا مگر ندیم سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ جب کافی رات ہو گئی اور بردہ فروش سو گئے تو ندیم نے دونوں لڑکیوں سے کہا۔

"رونا دھونا بے کار ہے۔ اگر رونے سے کوئی مسئلہ حل ہو سکتا تو میں تم سب سے زیادہ روتا۔ میرے ابّا اور امّی نے مجھ کو نصیحت کی تھی جب کبھی کوئی مشکل آن پڑے تو ہمّت ہار کر بیٹھنے اور رونے کے بجائے اس مشکل سے نجات پانے کے لیے سوچنا اور عمل کرنا چاہیے۔ اس طرح ہر مشکل ختم ہو جاتی ہے۔"

مگر فاروق اور جاوید کا تو رونا ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ آخر ندیم نے سوچا کہ مجھ اکیلے کو ہی کچھ کرنا ہو گا۔ یہ دونوں تو بس رونا ہی جانتے ہیں۔

ندیم سوچتا رہا۔ آخر دوسری رات بھی ختم ہو گئی اور دن چڑھ آیا۔ صبح کو ندیم نے ہمّت کر کے بردہ فروشوں سے کہا:

"دیکھیے جناب، ہم پرسوں سے اس غار میں بند ہیں۔ گرمی سے ہماری جان نکلی جا رہی ہے۔ آپ نے ہمارے ہاتھ بھی باندھ رکھے ہیں اور پاؤں بھی۔ کم از کم ہمارے پاؤں تو کھول دیجیے تا کہ ہم غار کے باہر جا کر چند منٹ تازہ ہوا ہی کھا لیا کریں۔ ہم بچّے ہیں۔ بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں؟"

ایک بردہ فروش نے دوسرے سے کہا۔ "کیا حرج ہے۔"

دوسرے نے جواب میں کہا۔ "نہیں نہیں۔ ان کو اسی گرمی میں جلنے دو۔" اس پر دوسرا چپ ہو رہا۔

ندیم نے ہمّت ہارنا تو سیکھا ہی نہ تھا، کہنے لگا۔ "جناب اگر ہم گرمی سے بیمار پڑ گئے تو آپ کے لیے مسئلہ بن جائیں گے اور پھر ہمیں کوئی نہیں خریدے گا۔"

یہ سُن کہ بردہ فروش ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ تھوڑی دیر کھسر پھُسر کرنے

کے بعد بوئے۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ہم صبح اور شام کے وقت صرف تمہارے پاؤں کی زنجیریں کھول دیا کریں گے۔ مگر سب کی ایک ہی دفعہ نہیں۔ ایک بچّے کی ایک وقت میں۔ وہ دس منٹ غار کے منہ کے پاس جائے۔ تازہ ہوا کھائے اور واپس آ جائے۔ ہم اس کو باندھ دیں گے تو دوسرا بچّہ جائے گا اور پھر تیسرا بچّہ باہر جائے گا۔"

ندیم بُہت خوش ہوا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ''تو جناب سب سے پہلے مجھے موقع دیجیے۔"

ایک بردہ فروش نے اس کے پاؤں کی زنجیر کھول دی اور وہ آزاد ہو گیا۔ وہ سیدھا غار کے منہ کی طرف گیا اور لگا ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے۔ اس نے ایک درخت پر شہد کی مکھیوں کا چھتّا بھی دیکھا۔ درخت غار کے منہ کے بالکل قریب تھا۔ وہ سوچنے لگا اور آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ وہ واپس غار کے اندر آ گیا۔ اس کے پاؤں کی زنجیریں باندھ دی گئی۔ پھر فاروق اور اس کے بعد جاوید کو تھوڑی دیر کے لیے آزاد کیا گیا۔ اس کے بعد بردہ فروش گھوڑوں پر سوار

ہو کر چلے گئے۔ ادھر بردہ فروش غار سے باہر نکلے اور فاروقی اور جاوید نے پھر رونا شروع کر دیا۔ اس پر ندیم بولا:

”آفرین ہے تم دونوں پر۔ خدا کے بندو، رونے کے علاوہ تھوڑی سی سوچ بچار بھی کیا کرو۔ میرے ذہن میں ایک ایسی ترکیب آئی ہے کہ اللہ نے چاہا تو آج شام ہم تینوں آزاد ہوں گے۔ تمہیں بس یہ کرنا ہے کہ بردہ فروش آئیں تو سردی کا بہانہ کر کے اپنے جسم پر اچھی طرح کمبل لپیٹ لینا اور کمبل سے باہر ہرگز منہ نہ نکالنا۔“

پھر اس نے پوری سکیم انہیں سمجھائی۔ جب شام کو بردہ فروش آئے تو وہ گھوڑے باہر باندھ کر غار کے اندر چلے آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ تینوں لڑکے کمبل میں لپیٹے ہوئے لیٹے ہیں۔ انہوں نے آگ جلائی اور گوشت بھوننے لگے۔ جب گرمی بڑھی تو قمیصیں اُتار دیں۔ ندیم اس موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بردہ فروش سے پاؤں کی زنجیریں کھولنے کو کہا۔ زنجیر کھلی تو وہ غار سے باہر اسی شہد کے چھتّے والے درخت کے نیچے آیا اور اپنے سر اور جسم کے تمام حصّوں پر اچھی طرح

کمبل لپیٹ لیا۔ پھر اس نے درخت کے پتلے سے تنے کو دونوں ہاتھوں سے خوب زور زور سے ہلانا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں چھتّے کی مکھّیاں غصّے سے بھنبھناتی ندیم پر حملہ آور ہوئیں۔ ندیم غار کے اندر بھاگا۔ مکھّیاں بھی پیچھا کرتی اندر گھس گئیں۔ ندیم تو ایک کونے میں جا بیٹھا اور مکھّیاں بردہ فروشوں کے ننگے جسموں پر چمٹ گئیں۔ وہ حواس باختہ ہو کر روتے چلاتے باہر بھاگے۔ غار کے منہ کے قریب ہزاروں مکھّیاں چکر کاٹ رہی تھیں۔ وہ ان پر ٹوٹ پڑیں۔ تھوڑی دیر میں دونوں سوج کر کپّا ہو گئے اور بے ہوش ہو کر گِر پڑے۔ تھوڑی دیر بعد ندیم چپکے سے اٹھا اور اپنے دوستوں کی زنجیریں کھول دیں۔ اس کے بعد وہ بردہ فروشوں کے گھوڑوں پر چڑھ کر شہر آئے اور پولیس کی مدد سے بُردہ فروشوں کو گرفتار کروادیا۔

دغاباز دوست

دوسرے دن سب لڑکے دیر سے اٹھے۔ شاہد نے پھر پٹھان کا بھیس بدل لیا۔ ناشتا کرنے کے بعد لڑکے سجّاد بابا سے ملے اور عمّار کی مُمانی اور بچّوں سے مل کر چٹاگانگ جانے کے لیے چل پڑے۔ شہلا نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ ابھی وہ گھر سے چند قدم ہی دور گئے تھے کہ پیچھے سے "عمّار عمّار" کی آواز آئی۔ چاروں لڑکے ٹھہر گئے اور مڑ کر دیکھا۔

"اوہو شہلا۔" شاہد نے آہستہ سے کہا۔ دروازے پر شہلا کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ تھا۔ لڑکے واپس آئے اور شہلا کے پاس آکر خاموش

کھڑے ہو گئے۔ شہلا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سب کو شہلا سے جُدا ہونے کا افسوس تھا۔ آخر شاہد نے ہمّت کر کے ہاتھ بڑھایا اور شہلا کے ہاتھ سے پیکٹ لیتے ہوئے بولا۔ ”اِنشاء اللہ ہم پر جلد ہی دوبارہ ملیں گے۔“

”پیکٹ یہاں مت کھولیے۔“ شہلا نے کہا۔ ”چٹا گانگ جا کر کھولیے۔“

”اچھا خدا حافظ۔“ شاہد نے ہاتھ ہلا کر کہا اور چلنے کے لیے قدم اٹھایا۔ شہلا دروازے پر کھڑی ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہہ رہی تھی۔

لاریوں کے اڈّے پر پہنچ کر انہوں نے چٹا گانگ جانے والی لاری پکڑی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ شاہجہاں ہوٹل میں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے آئندہ کے بارے میں پروگرام بنایا کہ اب وہ چٹا گانگ میں عمّار کے ماموں کے پاس جائیں گے۔ کیوں کہ فقط قاسم کو ہی پتا تھا کہ اکرم خان کہاں ہیں۔ انہوں نے بیرے سے کھانا منگوایا تو بیرا ساتھ ایک خط بھی لایا۔ یہ خط عمّار کی ماموں قاسم طرف سے تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا:

"عمّار بیٹے۔

میں آج حاجی شمس الدّین صاحب سے ملا تھا۔ اس وقت چٹا گانگ کے چپّے چپّے پر جاسوس موجود ہیں۔ تُم سب چٹا گانگ سے فوراً نکل جاؤ۔ میں تمہیں ہدایات دیتا رہوں گا۔"

خط پڑھ کر لڑکوں نے نیا پروگرام یہ بنایا کہ وہ چاٹ گاؤں سے شمال کی طرف فینی کے مقام پر جائیں گے۔ پھر ایک دو روز وہاں قیام کے بعد ریل سے لکشم یا کسی اور جگہ جائیں گے۔

انہوں نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور ایک تھیلے میں ضروری سامان رکھ کر اسٹیشن پہنچے، ٹکٹ خریدے اور فینی جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ان کے ڈبّے میں بہت بھیڑ تھی۔ شاہد نے تسلّی کرنے کے لیے آہستہ سے اپنا ہاتھ اندرونی جیب میں ڈال کر لعل کو چھوا۔ وہ جیب میں موجود تھا۔ گاڑی چل پڑی۔ رضا اور فُرسان اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ "خدا کے لیے آہستہ بات کرو۔ ممکن

ہے کوئی جاسوس یہاں موجود ہو۔" عمّار نے کہا۔

گاڑی چلتی رہی۔ جب گاڑی دھُوم پہنچی تو ان کے ڈبّے میں ایک فقیر چڑھ آیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس نے صاف سُتھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس نے پہلے تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہر شخص پر ایک نظر ڈالی اور پھر اِک تارا ہاتھ میں لے کر بنگالی زبان میں کچھ گانے لگا۔ عمّار اس کا گانا بھی سُن رہا تھا اور غور سے اس کو دیکھتا بھی جا رہا تھا۔ رضا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا مگر وہ فقیر کے گانے میں اس قدر محو تھا کہ رضا کی طرف بالکل توجّہ نہ دی۔ اندھیرا چھا چکا تھا اور گاڑی کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔

کافی دیر بعد فقیر کا گانا ختم ہوا تو لوگوں نے اسے پیسے دیے اور وہ خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ "کھانا کھانا" کی آوازیں لگاتے ہوئے بیرے آئے اور لوگوں کو کھانے اور چائے کے ٹرے دینے لگے۔ لڑکوں کو اگرچہ سخت بھُوک لگی تھی مگر انہوں نے سوچا کہ ریل کے کھانے سے نہ کھانا بہتر ہے۔ اچانک شاہد کو

پیکٹ کا خیال آیا۔ وہ اٹھا اور تھیلے سے پیکٹ نکال کر کھولا۔ اس میں تلی ہوئی مچھلی، چھوٹی چھوٹی گول روٹیاں اور فرنی کی چار پلیٹیں تھیں۔ لڑکوں کی باچھیں کھِل گئیں۔ انہوں نے اِدھر اُدھر کھسک کر جگہ بنائی اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔

"تمہیں کیسے خیال آیا کہ پیکٹ میں کھانا ہو گا؟" فُرسان نے پوچھا۔

"میں نے پیکٹ کو سونگھا تو مچھلی کی خوشبو آئی۔"

"میرا تو خوشی کے مارے نعرہ مارنے کو جی چاہتا ہے۔" رضا بولا۔

"تو تمہیں روکتا کون ہے؟" فُرسان نے کہا۔ "ہو جائے ایک ایک نعرہ؟"

"شہلا" رضا نے آہستہ سے نعرہ لگایا۔ "زندہ باد۔"

"مچھلی روٹی۔ زندہ باد۔" یہ فرمان کا نعرہ تھا۔ کھانے کے دوران میں رضا نے پوچھا کہ "یہ فقیر کیا گا رہا تھا؟"

”اسے تُم فقیر کے بجائے آوارہ گرد گویّا کہو تو زیادہ صحیح ہو گا۔“ عمّار بولا۔ ”ایسے آوارہ گویّے تمہیں کئی جگہ نظر آئیں گے۔ یہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اِک تارہ ہاتھ میں لیے سریلی آواز میں شعروں میں ڈھالی ہوئی کہانیاں سناتے ہیں۔ مگر یہ فقیر نہیں، جاسوس ہے۔ اس کی داڑھی نقلی ہے اور اس نے رات کے وقت بھی دھوپ کا چشمہ لگا رکھا ہے۔ خیر ہم چار ہیں۔ اس سے نپٹ سکتے ہیں۔ لیکن میرا مشورہ ہے کہ ہم فینی اُتر کر کسی اور ڈبّے میں بیٹھ جائیں اور لکشم جا اتریں۔ میں فینی سے لکشم کے ٹکٹ خرید لاؤں گا۔ لکشم میں میرا ایک بچپن کا دوست رہتا ہے۔“

فینی اسٹیشن آ گیا تھا۔ گاڑی آہستہ ہوتی گئی۔ پھر جھٹکے سے رُک گئی۔ چاروں لڑکے ڈبّے سے اُترے۔ عمّار تیزی سے باہر گیا اور چار ٹکٹ خرید لایا۔ اس نے لڑکوں کو کچھ سمجھایا۔ رضا اور عمّار آخری ڈبّے میں بیٹھ گئے۔ فُرسان اور شاید اس کے ساتھ والے ڈبّے میں گھُس گئے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی چل دی۔ سفر خیریت سے گزر گیا اور چاروں لڑکے لکشم جا اترے۔

راستے میں عمّار نے بتایا کہ لکشم میں میرا دوست کالو رہتا ہے۔ ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں۔ ایک ہی اسکول میں پڑھتے رہے ہیں۔ میں کئی سال کے بعد اس سے ملنے جارہا ہوں۔ وہ مختلف گلیوں کے چکر کاٹتا ہوا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایک تنگ سی گلی میں ایک مکان کے دروازے پر دستک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک دُبلا پتلا لڑکا باہر نکلا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے عمّار کے آنے کی کوئی خوشی نہ تھی۔

"کالو" عمّار نے اس کی طرف گرم جوشی سے ہاتھ بڑھایا۔ کالو نے بھی عمّار سے ہاتھ ملایا مگر اس انداز میں جیسے اس پر کوئی احسان کر رہا ہو۔ اسی طرح اس نے دوسرے لڑکوں سے بھی ہاتھ ملایا۔ "کیسے آنا ہوا؟" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کالو نے پوچھا۔

"تو کیا تم ہمیں اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟" عمّار نے کہا۔

اس سلوک پر عمّار کا دل جل گیا تھا۔ اسے اس بات پر بھی شرمندگی محسوس ہو

رہی تھی کہ فُرسان، رضا اور شاید اس کے دوست کے بارے میں کیا سوچیں گے۔

"ہوں؟" کالو جیسے سویا ہوا جاگ اٹھا۔ "اندر؟ میرا مطلب گھر کے اندر؟ ہاں ہاں۔ لیکن خیر اندر آیئے۔ اندر آیئے۔"

عمّار کچھ سوچنے لگا۔ دوسرے تینوں لڑکے بھی حیران تھے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کالو انہیں ایک تاریک سے کمرے میں لے گیا جہاں ایک چارپائی پڑی تھی۔

"بیٹھو۔" کالو نے رُکھائی سے انہیں بیٹھنے کو کہا اور لڑکے چارپائی پر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر کالو بولا۔ "کیسے آنا ہوا؟" عمّار بولا۔ "ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہتے۔ دراصل ہم خطرے میں ہیں۔ خطرہ دُور ہوتے ہی چلے جائیں گے۔"

"خطرہ؟ کیسا خطرہ؟" کالو نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ ہمارے پیچھے کچھ غنڈے لگے ہوئے ہیں۔“ عمّار بولا۔

”غنڈے؟ کیوں؟“ کالر نے پوچھا۔

”میں بتاتا ہوں۔“ شاہد جلدی سے بولا ”ہمارے پاس ایک بہت قیمتی امانت ہے۔ وُہ اسے اُڑانا چاہتے ہیں۔“

امانت کا لفظ سن کر کالو کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ بولا۔ ”یہ کیسی امانت ہے تمہارے پاس؟“

”میرے پاس ایک قیمتی لعل ہے۔“ شاہد نے اپنی جیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم اسے اس کے مالک کو پہنچانا چاہتے ہیں۔“

لعل کا نام سن کر کالو کی آنکھوں میں شیطانی چمک پیدا ہوئی۔ عمّار کسی گہری سوچ میں پڑ گیا تھا اور خاموشی سے کالو کو دیکھ رہا تھا۔ اب کالو کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ اتنے میں کمرے کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ کالو نے اسے آواز دی۔

”ادھر آؤ بُدّھو۔“

بُدّھو کمرے میں آ گیا۔

”بُدّھو؟“ رضا حیران ہو کر بولا۔ ”بڑا عجیب نام ہے۔“

”ہاں۔“ کالو جو اب ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا، بولا۔ ”اس کا اصل نام تو کچھ اور ہے لیکن چھوٹے بڑے سب اسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔ دیکھو بُدّھو، میں ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔ تم ان کا خیال رکھنا۔ جو مانگیں فوراً دے دینا۔ مہمان کی عزّت ہمارا فرض ہے۔“

لڑکوں نے بہتیرا روکا کہ وہ کوئی چیز نہ لائے مگر کالو نہ مانا اور یہی کہتا رہا کہ مہمان کا ہر طرح سے خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔

”تو آپ اسے بھیج دیں۔“ فُرسان نے بُدّھو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جی۔ جی نہیں۔ میں خود جاتا ہوں۔ میرا جانا ضروری ہے۔ نہ جانے یہ کیا گندی سڑی چیزیں اٹھا لائے۔“

"اِدھر آؤ بُدّھو۔" کالو نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد کالو جا چکا تھا اور بُدّھو چاروں دوستوں کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔

"بُدّھو" اچانک عمّار بولا۔ "ہمیں ایک مضبوط سی رسّی چاہیے۔ جلدی۔"

"ابھی لایا حضور۔" بُدّھو نے گھبراتے ہوئے کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

عمّار کا چہرہ غصّے سے تمتا رہا تھا اور وہ دانت پیس رہا تھا۔ لڑکے حیران تھے کہ عمّار کو کیا ہو گیا ہے۔

بُدّھو کے جانے کے بعد عمّار انگریزی میں لڑکوں کو کچھ کہنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں بُدّھو رسّی لے کر آگیا۔ پلک جھپکنے میں چاروں دوستوں نے بُدّھو کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور گھسیٹتے ہوئے اندر کے کمرے میں لے گئے۔ رسّی میں جکڑا ہوا بُدّھو بُری طرح رو رہا تھا۔

عمّار نے بُدّھو پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی اور کہا۔ "سچ بتا، کالو نے دوسرے کمرے میں جا کر تجھ سے کیا کہا تھا؟ بتا وہ کدھر گیا ہے؟"

پہلے تو بُدّھو کچھ نہ بولا مگر جب عمّار اس کی گردن دبوچ کر دبانے لگا تو وہ موت کے خوف سے سب کچھ اگلنے لگا۔

"ابھی بتاتا ہوں، مجھے مت مارو۔" بُدّھو روتے ہوئے بولا۔ "مالک نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آدھ گھنٹے سے پہلے آ جائیں گے۔ وہ کسی کو بتانے گئے ہیں کہ ان لڑکوں کے پاس دنیا کا سب سے قیمتی لعل ہے اور وہ اس وقت اس کے گھر میں ہیں۔"

عمّار نے بُدّھو کے گلے پر انگوٹھا رکھا اور دباتے ہوئے پوچھا۔ "بتا یہاں سے نکلنے کا سب سے محفوظ راستہ کون سا ہے؟ غلط بتایا تو جان نکال دوں گا۔"

بُدّھو نے کانپتے ہوئے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "اس کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے جس کے اندر ایک غار کا دروازہ ہے۔"

"اس دروازے کی چابی کہاں ہے؟" عمّار نے اس کا گلا گھونٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہائے ہائے مت مارو۔ بتاتا ہوں۔" بُدّھو نے روتے ہوئے کہا۔ "تہہ خانے میں ایک بڑا سا پتھر ہے۔ اس پتھر کی شکل ایک بندر کی سی ہے۔ بندر کا بایاں ہاتھ

اٹھائیں گے تو وہاں سے ایک چھُری نکلے گی۔ اس چھری کو بندر کے پیٹ میں گھونپنے سے اس کا منہ کھلے گا اور اس کے منہ میں سے چابی نکلے گی۔"

"شاہد، تم مکان کا دروازہ بند کر آؤ!" عمّار نے کہا۔ شاہد مکان کا دروازہ بند کر آیا۔ پھر انہوں نے بُدّھو کے مُنہ میں کپڑا ٹھونسا اور اسے ایک بڑی سی الماری میں بند کر دیا۔ لڑکے بھاگم بھاگ تہہ خانے کی سیڑھیوں پر پہنچے اور اندر سے دروازہ بند کر کے تہہ خانے میں آ گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک بڑے سے دِیے کی روشنی سے سارا تہہ خانہ روشن ہے۔ پتھّر کے بنے ہوئے سینکڑوں سانپوں اور بندروں کے درمیان ایک بڑا سا بندر تھا۔ چاروں دوست حیرت سے ان چیزوں کو دیکھنے لگے۔

"عمّار۔" فُرسان حیرت سے کہنے لگا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ کالو تمہارے ساتھ غدّاری کرے گا۔"

"میں نے تجربے سے سیکھا ہے کہ دنیا میں ہر شخص قابلِ اعتماد نہیں۔ دراصل

ہمیں کسی شخص پر اعتماد کرنے سے پہلے اچھی طرح اس کو پرکھ لینا چاہیے۔ کوئی شخص کسی بھی وقت احسان فراموش ہو سکتا ہے۔ کالو کے بارے میں سب سے پہلے مجھے اس وقت دکھ پہنچا جب میں نے دیکھا کہ اس نے مجھ سے بڑی رُکھائی سے ہاتھ ملایا۔ اسے ہمارے آنے کی کوئی خوشی نہ تھی بلکہ وہ ہمیں گھر کے اندر لانے سے بھی ہچکچا رہا تھا۔ پھر اس نے ہمیں ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر بیٹھنے کو کہا اور منہ بسورے بیٹھا رہا۔ لیکن لعل کا ذکر سُنتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور اس کا رویہ ایک دم بدل گیا اب اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اب اسے مہمان نوازی بھی یاد آگئی۔ پھر وہ بُدّھو کو لے کر دوسرے کمرے میں گیا۔ ان سب چیزوں سے میرا شُبہ یقین میں بدل گیا۔ آگے جو ہوا تمہیں معلوم ہے۔"

لڑکوں نے مل کر بندر کا وزنی بازو اٹھایا، اس میں سے ایک چھُری گری۔ انہوں نے چھُری بندر کے پیٹ میں گھونپی تو اس کا مُنہ کھلا اور تہہ خانے کے غار کے دروازے کی چابی نکلی۔ انہوں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور غار کے اندر داخل ہو گئے۔ پھر غار کے دوسرے منہ سے باہر نکل آئے۔

یہ ایک ویران سی جگہ تھی۔

چاروں دوست وہاں سے سیدھے اسٹیشن کی طرف بھاگے۔ عمّار نے کو میلا جانے والی گاڑی کے ٹکٹ خریدے اور چاروں دوست گاڑی میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور گاڑی فرّاٹے بھرتی ہوئی جارہی تھی۔

کھُلنا پہنچو

تیز دھوپ میں لڑکے کومیلا کے اسٹیشن پر کھڑے تھے۔ عمّار انہیں ایک معمولی سے ہوٹل میں لے گیا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ انہوں نے وہاں غسل کیا اور کھانا کھایا۔ پھر پروگرام بنانے لگے کہ اب کیا کِیا جائے۔ انہوں نے سوچا کہ شام کے طیارے سے ڈھاکے چلے جائیں گے۔

"لیکن ابھی تو ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ کیوں نے گھوم پھر کر کومیلا اور اس کے آس پاس کے علاقے دیکھے جائیں۔" شاہد نے تجویز پیش کی۔

اس کی تجویز فوراً مان لی گئی۔ پہلے انہوں نے شام کے طیارے میں کومیلا سے ڈھاکہ کے لیے سیٹیں ریزرو کروائیں اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر کومیلا کے مختلف حصّوں میں گھومتے رہے۔ ٹیکسی ڈرائیور سے پتا چلا کہ کومیلا سے پانچ میل کے فاصلے پر مینا متی کا شہر دریافت ہوا ہے۔ ہزار سال پرانا شہر ہے۔ لڑکوں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مینا متی چلنے کے لیے کہا۔ وہاں انہوں نے مینا متی شہر کے کھنڈر دیکھے۔ شہر میں بدھوں کے بہت سے مندر تھے اور ان میں مختلف قسم کے بُت دھرے تھے۔ ایک مندر میں مہاتما بدھ کا بڑا سا بت تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور سے پتا چلا کہ کومیلا سے پانچ میل کے فاصلے پر مینا متی کا شہر دریافت ہوا ہے۔ ہزار سال پرانا شہر ہے۔ لڑکوں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مینا متی چلنے کے لیے کہا۔ وہاں انہوں نے مینا متی شہر کے کھنڈر دیکھے۔ شہر میں بدھوں کے بہت سے مندر تھے اور ان میں مختلف قسم کے بُت دھرے تھے۔ ایک مندر میں مہاتما بدھ کا بڑا سا بت تھا۔

وہاں انہوں نے پرانے کتبے، مٹّی کے برتن اور دیگر اشیاء دیکھیں۔

اس کے بعد وہ ہوٹل واپس آئے۔ کھانا کھایا۔ پھر شام کے طیارے میں بیٹھ کر ڈھاکہ پہنچے۔ شاہد کے ماموں کا گھر ہوٹل الہلال کے قریب تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو انہیں رقعہ ملا جو عمّار کے ماموں قاسم کی طرف سے تھا۔ اس میں لکھا تھا:

"اگلے مہینے کی پہلی تاریخ تک تمہیں کھُلنا پہنچ جانا چاہیے۔ میں نے انتظام کر لیا ہے کہ تم چاروں سرحد پار کر کے کلکتے جاؤ گے اور وہاں سے میں تمہیں خود لے کر اکرم خان صاحب کے پاس جاؤں گا۔ امّی اور ماموں کو لعل کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ باقی باتیں پھر بتاؤں گا۔ کھُلنا کا پتا یہ ہے۔۔۔"

"ابھی ہمارے پاس تقریباً تین ہفتے ہیں۔" شاہد نے کہا۔ "لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ قاسم صاحب نے یہ کیوں لکھا ہے کہ امّی اور ماموں کو ہیرے کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔"

عمّار بولا۔ "جب تمہاری امّی کو پتا چلے گا کہ ہم لوگ صرف اس ہیرے کی وجہ سے خطروں میں گھِرے ہوئے ہیں تو وہ ہمیں سفر کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گی

اور پھر ہمیں بتانے ضرورت بھی کیا ہے؟"

چاروں لڑکے ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ شاہد کی امّی اور بہن بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔ "کیا لکھا تھا خط میں؟" شاہد کی امّی نے پوچھا۔

"امّی یہ میرے دوست عمّار ہیں۔ ان کے ماموں قاسم صاحب کا تو شاید آپ نے نام سُنا ہو گا۔ وہ ابّو کے گہرے دوست ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اگلے ماہ کی پہلی تاریخ تک ہمیں کھُلنا پہنچ جانا چاہیے۔ وہاں سے وہ ہمیں سُندر بن لے جائیں گے۔" شاہد کہہ رہا تھا۔

اتنے میں دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔

"آ جاؤ رجو۔" بیگم اکرم خان مُسکرائیں۔

"یہ رجو کون ہے امّی؟" شاہد نے پوچھا۔

"تمہارے ماموں کا بوڑھا ملازم۔ تقریباً بہرا ہے۔"

"رجو، آجاؤ اندر۔" شاہد کی امّی بولیں۔

"بی بی کھانا لے آؤں؟" رجو دروازے پر کھڑا جمائی لے کر بولا۔ شاہد کی امّی خود اُٹھیں اور اس کو ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کے لیے کہا۔

رجو نے بڑی پھرتی سے میز پر کھانا لگا دیا۔ اتنے میں شاہد کے ماموں بھی آ گئے۔ اب کمرے میں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ سب نے لطیفوں اور چٹکلوں کے درمیان کھانا شروع کیا۔ شاہد کی امّی نے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ جب انہوں نے پوچھا کہ اکرم خان ساتھ کیوں نہیں آئے؟ تو عمّار کہنے لگا کہ وہ ایک تجارتی دورے پر مغربی پاکستان گئے ہوئے ہیں۔ چند ہفتوں سے پیشتر واپس نہیں آ سکیں گے۔

کافی رات گئے تک لڑکے باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے اگلے روز کا پروگرام بنایا اور سو گئے۔

دوسری صبح انہوں نے غُسل کیا، ناشتے سے فارغ ہوئے اور شاہد کے ماموں کے

ساتھ ڈھاکہ کی سیر کرنے نکل گئے۔ سب سے پہلے وہ ٹورسٹ سینٹر گئے۔ وہاں سے انہوں نے شہر کا نقشہ اور کتابچے لیے۔

ڈھاکہ مشرقی پاکستان کا دارالحکومت ہے۔ اس کی آبادی پانچ چھ لاکھ سے زیادہ اور علاقہ تقریباً ۲۸ مربع میل ہے۔ اس کی بنیاد ۱۶۰۸ء میں رکھی گئی تھی۔ اب یہ صنعتی اور تجارتی مرکز بن گیا ہے۔ اس میں پٹ سن کے کئی کارخانوں کے علاوہ سوتی کپڑا اتیار کرنے والی ملیں، کھانڈ ربڑ اور چمڑے کے کارخانے بھی ہیں۔ یہاں سونے چاندی اور سیپ کا کام بھی ہوتا ہے۔ ڈھاکہ میں ایک یونیورسٹی اور کئی کالج ہیں۔ یہاں کی کئی عالی شان عمارتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔"

"بس کرو رضا۔" عمّار نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں نہ ان کتابچوں کی ضرورت ہے نہ نقشے کی۔ میں کئی سال تک ڈھاکہ میں رہا ہوں۔ جس طرف میں کہتا ہوں اسی طرف چلو۔ میں تمہیں ڈھاکہ کی سیر بہت جلد کرا دوں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" رضا نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

عمّار مختلف جگہوں کے چکّر کاٹتا ہوا انہیں ستارہ مسجد لے گیا۔ لڑکے مسجد کو دیکھ کر بہت خُوش ہوئے۔

"اس مسجد کے دروازوں، محراب اور گنبدوں غرض کہ ہر جگہ ستاروں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اس کا نام ستارہ مسجد مشہور ہو گیا ہے۔" عمّار نے کہا۔ کچھ دیر مسجد میں ٹھہر کر عمّار انہیں قلعہ لال باغ میں لے گیا۔ وہ انہیں قلعہ کے مختلف حصّے دکھاتا رہا۔ عظیم الشّان قلعہ دیکھ کر لڑکوں کو لاہور کا شاہی قلعہ یاد آ گیا۔ اس کے بعد وہ انہیں بی بی پری کے مقبرہ بارہ کڑہ اور حسینی دالان میں لے گیا۔ موٹر سے انہوں نے ایک مسجد کا نظارہ کیا جس پر بہت سے گنبد بنے ہوئے تھے۔ عمّار نے بتایا۔ "اس کے سات گنبد ہیں اور اسی وجہ سے اس کا نام ست گنبد مسجد پڑ گیا ہے۔"

لڑکے شام کو گھر لوٹے۔ دوسرے دن انہوں نے نئی عمارتیں دیکھیں۔ سب سے پہلے وہ کرزن ہال گئے۔ یہ ایک بہت شان دار ہال تھا۔ وہاں سے وہ ہائی کورٹ کی عمارت دیکھنے گئے۔ عمّار انہیں مختلف کمروں اور ان کے پس منظر کے بارے میں

بتاتا رہا۔ پھر وہ گورنمنٹ ہاؤس اور زرعی انسٹیٹیوٹ کی عمارات دیکھنے کے لیے گئے۔

غرض اسی طرح وہ شام تک گھومتے رہے۔ اور انہوں نے مختلف مقامات کی تصاویر بھی لیں۔ اس کے بعد عمّار انہیں بلدا گارڈن کے عجائب گھر میں لے گیا۔ وہاں انہوں نے ڈھاکہ کی مشہور ململ اور مختلف قسم کے زیورات کے نمونے دیکھے۔ اس عجائب گھر کے بعد وہ انہیں یونیورسٹی عجائب گھر لے گیا۔ اس میں ہزاروں سال پرانے بُت، عجیب شکلوں کے سکے اور تصاویر تھیں۔ شاہد نے افسروں سے اجازت لے کر چند سکّوں اور بتوں کی تصویریں لیں۔

ایک ہفتہ انہوں نے ڈھاکہ کی سیر کی اور اس کے بعد ٹرین کے ذریعے کھُلنا روانہ ہو گئے۔

خطرناک سفر

کھُلنا اسٹیشن پر بہت رش تھا۔ لڑکوں نے گاڑی سے اپنا مختصر سامان نکالا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر سلیم ہوٹل میں پہنچ گئے۔ راستے میں ٹیکسی ڈرائیور نے نہیں ٹوٹی پھوٹی اُردُو میں بتایا کہ کھُلنا ریلوں اور اسٹیمروں کا جنکشن ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے اس کی آبادی زیادہ نہیں تھی لیکن اب یہاں تقریباً دولاکھ انسان بستے ہیں۔

”کیانام ہے تمہارا؟“ رضا نے پوچھا۔

”جی۔جی حسن۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

ڈرائیور کو پیسے دیتے وقت شاہد نے دوسری صُبح اُسے ہوٹل آنے کے لیے کہا۔ چاروں دوستوں کا خیال تھا کہ وہ باقرہاٹ تک کشتی میں بیٹھ کر جائیں گے اور دریا کی سیر کا لطف اٹھائیں گے۔ چاروں لڑکے تھکن محسوس کر رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد سو گئے اور رات دس بجے تک غافل پڑے رہے۔ دس بجے کے بعد اٹھے اور کھانا کھا کر شطرنج کھیلنے لگے۔

عمّار اور شاہد کھیل رہے تھے اور رضا اور فُرسان ان کی چالوں سے لطف اٹھا رہے تھے۔

دونوں لڑکے شطرنج کے ماہر تھے۔ کافی دیر شطرنج کھیلنے کے بعد پتا چلا کہ دونوں شاطروں نے ایک دوسرے کے تمام مہرے پیٹ ڈالے ہیں اور اس طرح دونوں برابر رہے ہیں۔

"یہ کھیل۔" شاہد نے فُرسان سے کہا۔ "انسان کی غور و فکر کو بڑھاتا ہے۔ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں اور خاص طور پر روس میں تو گھر گھر کھیلا جاتا ہے۔ لیکن اس

کھیل میں ایک نقص ہے۔ یہ آدمی کو کاہل بنا دیتا ہے۔"

شطرنج کھیلنے کے بعد وہ سیر کے لیے نکلے اور قریب کے ایک پارک میں بیٹھ کر اِرد گرد کا نظّارہ کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس ہوٹل میں پہنچے اور سو گئے۔ صبح کو غسل اور ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ حسن ڈرائیور اپنی گاڑی لے آیا۔ لڑکوں کا پروگرام تھا کہ وہ چند میل دور باقرہاٹ تک جائیں گے اور شام سے پہلے پہلے لوٹ آئیں گے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے کھانے پکانے کا سامان ساتھ رکھ لیا تھا۔ دریا کے کنارے پر زیادہ رش نہیں تھا۔ لڑکے ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ ایک یورپی مرد اور عورت بھی سوار ہونے لگے مگر کشتی کا ملّاح ان کو بٹھانے پر کسی طرح رضامند نہ ہوتا تھا۔ بات بڑھ گئی۔ حتّٰی کہ ملّاح اور یورپی مرد میں جھگڑا ہو گیا۔ آس پاس جو چند لوگ جمع تھے انہوں نے ملّاح کو لعنت ملامت کی اور کافی سمجھایا تو وہ تیار ہوا۔

"نہ معلوم یہ ملّاح انہیں بٹھانے پر راضی کیوں نہیں ہوتا تھا؟" عمّار نے شاہد سے کہا۔

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔ ضرور کوئی وجہ ہونی چاہیے۔" شاہد نے جواب دیا۔

باقرہاٹ سے کچھ فاصلے پر سنسان سی جگہ تھی۔ عمّار کے کہنے پر لڑکے وہیں اُتر گئے۔ انہوں نے ملّاح کو پیسے دیے اور پکنک کا سامان اتار کر ساحِل پر رکھ دیا۔ شاہد نے کشتی اور ملّاح کی تصویر لینا چاہی تو ملّاح نے چہرہ چھپا دیا۔

"یہ عجیب آدمی ہے۔" شاہد نے کہا۔ "پہلے ان غیر ملکیوں سے بلا وجہ جھگڑا اور اب تصویر اتارنے پر کیوں منہ چھپا رہا ہے۔ جیسے پردہ دار خاتون ہو۔"

"لعنت بھیجو۔" عمّار نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔ شاہد منہ میں بڑبڑاتا ہوا لڑکوں کے ساتھ ایک درخت کے نیچے آیا۔ وہاں انہوں نے چادر بچھائی اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ پھر گانے گائے گئے اور اس کے بعد کھانا پکایا گیا۔ دوپہر کے وقت جب دھوپ تیز ہوئی تو چاروں دوست واپس چلنے کے لیے سامان باندھنے لگے۔

اس وقت دریا کے کنارے فقط دو تین کشتیاں تھیں۔ لڑکے پھر اسی کشتی میں جا

بیٹھے جس میں وہ آئے تھے۔ ملّاح کشتی کو بہت آہستہ آہستہ کھے رہا تھا۔ لڑکوں نے اس طرف دھیان نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کشتی میں چار آدمی بیٹھے ہیں اور بڑی تیزی سے ان کے قریب آرہے ہیں۔ جب وہ بیس پچیس گز کے فاصلے پر پہنچ گئے تو لڑکوں کی کشتی کے ملّاح نے زور سے سیٹی بجائی۔ لڑکے چوکنّے ہو گئے۔

''عمّار'' شاہد نے اپنے حواس جمع کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم پانچ جاسوسوں کے نرغے میں ہیں۔ اگر انہوں نے پہل کی تو مردوں کی طرح لڑنا۔ تخت یا تختہ۔'' شاہد جلدی جلدی لڑکوں کو ہدایات دینے لگا۔

دوسری کشتی ان کے قریب آچکی تھی۔ اس میں سے دو آدمی اُن کی کشتی میں کودنے لگے۔ لڑکے اپنی کشتی کی دائیں طرف کھڑے ہو گئے اور ہوا میں زور سے اچھلے۔ وہ اچھل کر دائیں طرف گِرے تو کشتی ایک طرف جھٹکا کھا کر جھُک گئی۔ دونوں آدمی دریا میں جا گِرے اور ساحل کی جانب تیرنے لگے۔ اس کے فوراً بعد چاروں دوست اپنی کشتی کے ملّاح کی طرف بڑھے اور اسے گردن سے دبوچ لیا۔

شاہد نے چیخ کر کہا۔ ”عمّار تم کشتی کے چپّو تھام لو اور اس کشتی کو اپنی کشتی سے دور رکھنے کی کوشش کرو۔“

عمّار نے ایسا ہی کیا۔ شاہد کے جسم میں نہ جانے کہاں سے بجلیاں دوڑ گئیں۔ اس نے پوری قوّت سے ملّاح کے جبڑے پر گھونسے لگانے شروع کر دیے۔ ملّاح کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔

شاہد نے اچانک اسے چھوڑ دیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر دوہرا بنا کر اس کی ٹھوڑی پر اتنے زور سے مارا کہ اس کی چیخ نکل گئی اور وہ چکرا کر چاروں شانے چِت گر پڑا۔ شاہد انتہائی تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور چھاتی پر بیٹھ کر اس کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ پھر اس نے اس کے سر کو اُٹھایا اور کشتی کے فرش پر دے مارا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

دریا میں گرنے والے دونوں آدمی ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ایک کشتی میں چھلانگ لگا کے چڑھنے کے بعد کشتی کو لڑکوں کی طرف کھینا شروع کر دیا

تھا۔ ان کے ساتھی بھی آہستہ آہستہ لڑکوں کی جانب آرہے تھے۔

شاہد عمّار کی طرف بڑھا اور اس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ عمّار نے کشتی کو کھینا بند کر دیا اور اس کی جگہ رضا بیٹھ گیا۔ ایک چپّو عمّار نے باہر نکال لیا تھا۔ اچانک تیسری کشتی لڑکوں کے قریب سے گزری۔ عمّار اور شاہد موقع کے منتظر تھے۔ اس سے پہلے کہ تیسری کشتی کے آدمی لڑکوں کی کشتی میں کودتے، شاہد اور عمّار نے بڑی پھرتی سے چھلانگ لگائی اور ان کی کشتی میں کود گئے۔ مگر عمّار کا پاؤں پھسل گیا اور وہ دریا میں گِرا مگر اس نے جلدی سے کشتی کی رسّی پکڑ لی اور اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

دونوں آدمی شاہد کی طرف بڑھے اور اس کو جکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ شاہد نے ایک آدمی کے پیٹ میں اس زور سے لات ماری کہ اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔ اتنے میں دوسرا آدمی شاہد کے منہ پر گھونسا مار چکا تھا۔ شاہد کو گھونسا کیا لگا طیش سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ وہ اس کی طرف بھُوکے شیر کی طرح جھپٹا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ شاہد نے اسے ٹانگوں سے پکڑا اور اٹھانے کی

کوشش کی مگر وہ کافی وزنی تھا۔ شاہد نیچے جھکا ہوا تھا کہ اوپر سے آدمی نے شاہد کا گلا پکڑ کر دبانا شروع کر دیا۔ شاہد کو سانس گھٹتی محسوس ہوئی تو اس نے اسی حالت میں اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ اس کا توازن بگڑ چکا تھا اور گرنے کے قریب تھا کہ دوسرا آدمی جس کے پیٹ میں شاہد نے لات ماری تھی شاہد کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے بڑی زور سے شاہد کے ٹھوکر لگائی مگر شاہد ایک دم دوسری طرف جھک گیا اور وہ اپنے ہی زور میں زمین پر گر گیا۔ اتنی ہی دیر میں عمّار کشتی پر آدھا چڑھ چکا تھا۔ شاہد نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی اور اپنے گلے سے اس آدمی کی انگلیوں کو چھڑانے کی کوشش کی۔ آخر تھوڑی سی جدوجہد کے بعد وہ کامیاب ہو گیا۔ اب دونوں ایک دوسرے پر گھونسوں کی بارش کر رہے تھے۔ گرا ہوا آدمی پھر کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ شاہد کی طرف بڑھا۔ مگر اسے پیچھے سے عمّار نے پکڑ لیا۔ اب شاہد ایک ہی آدمی سے گھونسے بازی میں مصروف تھا۔ اتنے میں نہ جانے شاہد کو کیا سوجھی کہ اس نے اپنے ہاتھ ایک دم زمین پر لگا کر فلائنگ کک اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ دولتی کھا کر گرا۔ شاہد بجائے اس کی

طرف بڑھنے کے کشتی کے چپوؤں کی طرف بڑھا۔ وہ آدمی ابھی کھڑا ابھی نہیں ہو سکا تھا کہ شاہد نے چپّو کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ چوٹ بڑے زور کی تھی۔ وہ درد سے کراہنے لگا۔ اتنی دیر میں شاہد کا چپّو پھر ہوا میں بُلند ہو چکا تھا۔ اس آدمی کے اٹھتے پھر اس کے سر پر پڑا اور وہ گر پڑا۔ اب وہ چپّو کھا کھا کر بے حال ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں کشتی میں موجود دوسرا آدمی عمّار سے اپنے آپ کو چھُڑا کر شاہد کی طرف جھپٹا۔ شاہد نے اس کی جانب رُخ کیا اور زور سے چپّو اس کے سر پر دے مارا۔ اب ایک چپّو سے وہ دونوں آدمیوں کو مار رہا تھا۔ عمّار اس اثنا میں دوسرا چپّو لے آیا تھا۔ انہوں نے چپّو مار مار کر دونوں بد معاشوں کو بے ہوش کر دیا۔

اب جو انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو پتا چلا کہ دوسری کشتی کے آدمی اپنے ساتھیوں کا یہ حشر دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بات یہ ہوئی کہ جب شاہد اور عمّار لڑ رہے تھے تو رضا اور فُرسان کشتی کو کھے کر دوسری کشتی والوں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ برابر ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ ان کے درمیان لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی اور وہ بغیر لڑے بھِڑے ڈر کر بھاگ اٹھے۔

اس عرصے میں عمّار اور شاہد دونوں آدمیوں کو بے ہوش کر چکے تھے۔ اب دونوں کشتیوں پر لڑکوں کا قبضہ تھا۔ شاہد نے عمّار سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر کشتی کی رسّی سے بے ہوش آدمیوں کو باندھنے میں مدد کرے مگر عمّار تھک کر چور ہو چکا تھا۔ یہی حال شاہد کا تھا۔ پھر بھی اس نے ہمّت کی اور آگے بڑھ کر ایک آدمی کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگا۔ اس پر عمّار کو شرم آئی اور وہ شاہد کی مدد کے لیے بڑھنے لگا۔ مگر بے حال ہو کر رہ گیا۔ آہستہ آہستہ شاہد نے دوسرے آدمی کو بھی رسّی سے باندھ دیا۔

اُدھر فُرسان اور رضا کشتی کھیلتے ہوئے ان کے قریب آ رہے تھے۔ ''ان کا پیچھا کرو۔'' شاہد نے چلّا کر رضا اور فُرسان سے کہا مگر انہوں نے کچھ نہ سُنا۔ شاہد بے دم ہو کر رہ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی مگر اسے محسوس ہوا کہ اس میں ہاتھ اٹھانے کی بھی سکت نہیں رہی۔ دوسری کشتی اب دور ہوتی جا رہی تھی۔ اِدھر رضا اور فُرسان ان کے قریب پہنچ رہے تھے۔ جب ان کی کشتی شاہد کی کشتی کے بالکل قریب آ گئی تو وہ کود گئے۔ شاہد کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے

ہوشی میں کہہ رہا تھا۔ ان کا پیچھا کرو۔ ان کا پیچھا کرو۔"

رضا اور فُرسان نے نظر اٹھا کر دیکھا تو دونوں آدمی ان سے کافی دور نکل گئے تھے۔ اچانک گولی چلنے کی آواز آئی۔ شاہد کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک کشتی میں وہی یورپی مرد اور عورت بیٹھے بھاگنے والے بد معاشوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ عورت بڑی مہارت سے کشتی چلاتے ہوئے ان کے پیچھے جا رہی تھی اور مرد کھڑا ہوا میں فائر کر رہا تھا۔ وہ اب ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یورپی مرد نے انگریزی میں ان سے کہا کہ کشتی لے کر ان لڑکوں کے پاس چلو ورنہ گولی مار دوں گا۔ دونوں آدمی کشتی کھیتے ہوئے اب لڑکوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جب یورپی اور ان دونوں کی کشتی لڑکوں کی کشتیوں کے قریب پہنچیں تو رضا اور فُرسان رسّیاں لیے پہلے ہی تیّار تھے۔ یہ دیکھ کر یورپی مرد اور عورت ہنس پڑے۔ عمّار بے سُدھ سا پڑا تھا لیکن اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ رضا اور فُرسان آگے بڑھے اور دونوں بد معاشوں کے ہاتھ اور پاؤں خوب کَس کَس کر باندھنے لگے۔ اتنے میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وہ پہلا ملّاح جو لڑکوں اور یورپی

مرد اور عورت کو لے کر آیا تھا، ہوش میں آ چکا تھا۔ اس نے ارد گرد گردن گھُمائی اور جب دیکھا کہ کوئی راستہ بچ کر نکلنے کا نہیں تو دریا میں چھلانگ لگا دی۔ یہ دیکھ کر یورپی مرد نے جلدی سے اپنی قمیص اتاری اور پستول عورت کے حوالے کر کے دریا میں کود گیا۔ یہ یورپی بھی غضب کا تیراک تھا۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں ملّاح کو جا دبوچا۔ اب دونوں کی پانی میں لڑائی شروع ہو گئی۔

"شرم کی بات ہے رضا۔" فُرسان بولا۔ "یہ شخص تو ہمارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالے اور ہم یہاں تماشا دیکھیں۔"

یہ سن کر رضا نے کشتی کو اسی طرف کھینا شروع دیا جدھر ملّاح اور یورپی لڑ رہے تھے۔ ان کے قریب پہنچ کر فُرسان نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

اتنی دیر میں یورپی مرد ملّاح پر غالب آ چکا تھا۔ اس نے اسے بالوں سے گھسیٹ کر کشتی میں لانے کی کوشش کی۔ اس کی ساتھی عورت اپنی کشتی ان کے قریب لا چکی تھی۔ دونوں نے مل کر ملّاح کو جو اب غوطے کھا کھا کر بے حال ہو چکا تھا کشتی

میں لادا۔ ملّاح کشتی میں آتے ہی بے جان ہو کر گرا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

"بچاؤ بچاؤ۔" اتنے میں رضا کی چیخ ابھری۔ فُرسان ڈوب رہا تھا اور رضا نے اسے بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔

مصیبت یہ تھی کہ دونوں تیرنا نہیں جانتے تھے۔ اور اب وہ ڈُوب رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو یورپی بھی چکرا گیا۔

"اسے بچاؤ۔" یورپی مرد نے رضا کی طرف اشارہ کر کے اپنی ساتھی عورت سے کہا اور خود فُرسان کی طرف کود گیا۔ ذرا سی دیر میں اس نے فُرسان کے بال پکڑ لیے اور گھسیٹتا ہوا کشتی کی طرف لے آیا۔ دوسری طرف عورت بھی کود چکی تھی اور رضا کو بالوں سے پکڑے ہوئے کشتی کی طرف لا رہی تھی۔ جب وہ کشتی کے قریب پہنچی تو یورپی مرد نے ہاتھ بڑھایا اور رضا کو اوپر کھینچ لیا۔ رضا اور فُرسان بے ہوش پڑے تھے اور یورپی مرد اور عورت ان کے پاس بیٹھے ہانپ رہے تھے۔

اُدھر عمّار اور شاہد کی تھکن دور ہو چکی تھی۔ وہ کشتی کھے کر یورپی مرد کی کشتی کی طرف لانے کی کوشش کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ان کے ساتھ کھڑے تھے۔

"ان دونوں کو رسّیوں سے کس نے جکڑا ہے؟" شاہد نے حیران ہو کر عمّار سے پوچھا۔

"ان دونوں نے۔" عمّار نے مسکرا کر فُرسان اور رضا کی طرف اشارہ کیا جو بے ہوش پڑے تھے۔

"رضا اور فُرسان نے تعاقب تو خوب کیا ہو گا۔" شاہد نے کہا۔

"نہیں۔" عمّار مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ وہ خود کو گرفتار کرانے کے لیے خود ان کے پاس آئے تھے۔"

"میں مطلب نہیں سمجھا؟" شاہد بولا۔

"بات یہ ہوئی۔" اچانک رضا نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "کہ اِن صاحب نے ان کو پستول دکھا کر ہماری کشتی کی طرف چلنے کے لیے حکم دیا تھا۔" اتنا کہہ کر رضا پھر بے ہوش ہو گیا۔

عمّار اور شاہد کا قہقہہ نکل گیا۔ یورپی مرد اور عورت بھی مسکرا رہے تھے۔ عمّار اور شاہد نے مل کر بے ہوش ملّاح کی بھی خوب کس کر مشکیں باندھ دیں۔ پھر سب لڑکے کشتیوں میں بیٹھ گئے اور اپنا پکنک کا سامان بھی لاد لیا۔

ایک کشتی کو عمّار اور دوسری کو شاہد کھیتے ہوئے کھلنا کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں یورپی مرد نے اپنے ابتدائی طبی امداد کے سامان میں سے چند گولیاں نکالیں اور سب کو کھانے کے لیے دیں۔ اس سے لڑکوں نے اپنی طبیعت میں کچھ چُستی محسوس کی۔ شام سے پہلے پہلے دونوں کشتیاں اپنی منزلِ مقصود پر کھڑی تھیں۔ کنارے پر اُتر کر انھوں نے پانچوں آدمیوں کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

یورپی جوڑا تبھی لڑکوں کے ساتھ ہوٹل سلیم میں آگیا۔ رات کے وقت سب ایک

کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور بیٹے ہوئے واقعے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔

یورپی جوڑا سب سے زیادہ رضا اور فُرسان کی نوک جھونک اور مزاحیہ باتوں پر قہقہے لگا رہا تھا۔

"جب تم جانتے تھے کہ تم تیرنا نہیں جانتے تو تم نے دریا میں چھلانگ کیوں لگائی تھی؟" یورپی مرد نے رضا اور فُرسان سے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"ڈوب مرنے کے لیے۔" شاہد نے لُقمہ دیا اور سب قہقہے مارنے لگے۔

کھُلنا کی طرف واپس آتے ہوئے راستے میں ان سب کا آپس میں تعارف ہو چکا تھا۔ یورپی مرد اور عورت جرمنی کے رہنے والے تھے۔ ان دونوں کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی اور اب وہ مختلف ملکوں کی سیر کرتے ہوئے مشرقی پاکستان میں سندر بن کے شکار کے لیے آئے ہوئے تھے۔ مرد کا نام رولینڈ اور عورت کا نام گُن تھا۔ وہ رات گئے ایک باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے سندر بن میں

شکار کھیلنے کا پروگرام بنایا اور سو گئے۔

سُندر بن

دوسرے دن رولینڈ نے محکمہ جنگلات کے افسروں سے سندر بن میں شکار کھیلنے کی اجازت لے لی۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ چالنا کے قریب دیہاتوں میں ایک آدم خور شیر نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔

رضا اور فُرسان نے کبھی خواب میں چوہا بھی مارنے کی جرأت نہ کی تھی۔ وہ جب سوچتے کہ وہ شیر کے شکار پر جا رہے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

رولینڈ نے شاہد اور عمّار کے ساتھ بازار جا کر ان ایک بکرا خریدا اور ایک نئی شاٹ

گن کے علاوہ کارتوسوں کی چند پیٹیاں بھی خریدیں۔

ہوٹل میں رضا، فُرسان اور گُن رہ گئے تھے۔ رضا اور فُرسان نے اپنی دل چسپ باتوں اور حرکتوں سے گُن کو خوب ہنسایا۔

"فرض کرو تم اکیلے جنگل میں ہو اور سامنے سے دھاڑتا ہوا شیر نکل آئے تو تم کیا کروگے رضا؟" فُرسان نے پوچھا۔

رضا نے جھُرجھُری لی اور بولا۔ "بس یہی کہ کان پکڑ کر مُرغا بن جاؤں گا۔"

اس پر گُن کا قہقہہ نکل گیا۔ اس نے کہا۔

"میرے خیال میں تم دونوں ہمارے ساتھ نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے۔"

"یہ تو سب مذاق تھا۔" فُرسان نے گہرا سانس لے کر چھاتی پھلاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ آپ دیکھ لیں گی کہ بہادر ہم ہیں یا کوئی اور۔"

اتنے میں شاہد، عمّار اور رولینڈ آ گئے اور پھر شام کا کھانا کھا کر دوسرے دِن چلنے کی

تیّاری شروع ہو گئی۔

اگلے روز صبح ہی صبح سب ایک بڑی سی کشتی میں بیٹھ کر چالنا پہنچے۔ چالنا کھُلنا سے اٹھارہ میل جنوب میں ایک نئی بندر گاہ ہے۔ سندر بن نہایت خوب صورت جنگل ہے۔ یہ کھُلنا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہاں پر ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور بے شمار ندی نالے ہیں۔ بعض اوقات یہ حیرت انگیز چیز دیکھنے میں بھی آتی ہے کہ ایک ہی ندی کا پانی دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا ہے اور ایک حصّہ تو آگے کی طرف بہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی مخالف سمت میں۔

چالنا پہنچ کر رولینڈ نے چند مزدور چُنے اور انہیں جنگل کے بیچ تین چار درختوں پر مچان باندھنے کے لیے کہا۔ ایک ندی ان مچانوں کے قریب ہی بہتی تھی۔ مزدوروں نے رولینڈ کو بتایا کہ آدم خور شیر اکثر رات کے وقت یہاں پانی پینے آتا ہے۔ انسانوں کا شکار کرنے کے لیے بھی وہ اسی راستے سے چالنا کے دیہاتوں میں جاتا ہے۔ تقریباً ایک ہفتے سے شیر جنگل سے باہر نہیں نکلا۔

گفتگو کے دوران میں جب کبھی شیر کا ذکر آتا تو رضا اور فُرسان کے چہرے پیلے پڑ جاتے اور وہ ایک دوسرے کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھتے۔ یہ دیکھ کر شاہد ان دونوں کو ایک طرف لے گیا اور انہیں خوب شرم دلائی۔ ”دیکھو یہ گُن عورت ذات ہو کر اتنی نڈر ہے اور تم ہو کہ شیر کا نام سن کر تمہاری رنگت پیلی پڑ جاتی ہے۔“

”خدا کے واسطے۔“ رضا نے لڑکھڑائی ہوئی زبان میں کہا۔ ”ہمیں یہاں سے واپس لے چلو۔ ہم سے یہ ظلم نہیں دیکھا جائے گا۔“

”کون سا ظُلم؟“ شاہد نے پوچھا۔

”یہی، بے قصور شیر کو گولی مارنے کا۔“ فُرسان بولا۔

”اور جو شیر نے کئی بے قصور آدمیوں کو ہلاک کر دیا ہے، وہ ظلم نہیں؟“ شاہد نے پوچھا۔

”اللہ ظالم کو خود سزا دے گا۔“ فُرسان بولا۔

”تم تو پاگل ہو گئے ہو۔ تمہارا کام اب فقط یہ ہے کہ مچان پر بیٹھے رہنا اور شکار ہوتے دیکھنا۔“

”اللہ کرے ایسے شیر کو چھپا کی نکل آئے۔“ رضا بڑبڑایا۔

یہ سن کر شاہد کا قہقہہ نکل گیا۔ آخر بڑی مشکل سے تم انہیں مچان پر چڑھایا گیا۔ دونوں کو کھانے پینے کی چیزیں بھی دے دی گئیں تاکہ کا دل بہلتا رہے۔ ان کے مچان پر شاہد بھی چڑھ گیا۔ دوسرے مچان پر رولینڈ اور گُن بیٹھے تھے۔ تیسرے مچان پر عمّار تھا۔ مزدوروں نے بکرا باندھ دیا تھا۔ شاہد اور عمّار کے ہاتھوں میں رائفل تھی اور رولینڈ کے ہاتھوں میں شاٹ گن۔ مزدور بھی اِرد گرد کے درختوں پر چڑھ چکے تھے۔

”دھم۔“ رضا مچان پر گرا اور شاہد نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا ورنہ وہ مچان سے نیچے گرتا تو ہڈّی پسلی ایک ہو جاتی۔ رضا کے گرنے کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ دُور جنگل میں کہیں اُلّو چیخا تھا اور رضا اسے شیر کی آواز سمجھا تھا۔

”تم دونوں بے شرم ہو۔“ شاہد نے غصّے سے رضا اور فُرسان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم ہمارے ساتھ آئے ہی کیوں تھے۔“

”کوئی رسّی ہے؟“ فُرسان نے پوچھا۔

”یہ تمہارے پاؤں کے نیچے کیا ہے؟“ شاہد نے کہا۔

رضا اور شاہد ایک لمبی سی رسّی لے کر کچھ کرنے لگے۔

اچانک ایک طرف سے شیر کی دہاڑ سنائی دی۔ شاہد نے رائفل سنبھال لی اور فُرسان اور رضا کی طرف دیکھا۔ دونوں نے کانوں میں انگلیاں دی ہوئی تھیں اور آنکھیں بند تھیں۔

”استغفر اللہ۔“ شاہد نے منہ میں کہا اور مسکرایا۔

شیر کی دہاڑ بُلند ہوتی جارہی تھی۔ ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ قریب ہی پرندوں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔

”شیر آرہا ہے۔“ شاہد نے رضا اور فُرسان سے کہا۔ ”مضبوطی سے بیٹھنا۔ اگر اب کے گِرے تو شیر کا لقمہ بن جاؤ گے۔“

رضا رونے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی فُرسان کے آنسو جاری ہو گئے۔ شاہد نے بڑی مشکل سے انہیں منا کر چُپ کرایا اور کہا کہ اگر تم خاموشی سے یہاں بیٹھے رہے تو شیر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اچانک بکرے کے ممیانے کی آواز آئی۔

”شی“ شاہد نے منہ پر انگلی رکھ کر فُرسان اور رضا سے کہا۔ ”آواز بالکل نہ نکلے۔“

شیر آہستہ آہستہ ندی کی جانب آرہا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ پہلے ہی دن شیر ان کی زد میں آگیا تھا۔ رولینڈ نے شاہد سے کہا تھا کہ جونہی میری شاٹ گن میں لگی ہوئی بتّی روشن ہو فائر کر دینا۔ شاہد اس سے پیشتر کئی مرتبہ اپنے ماموں اور ابّو کے ساتھ مختلف جانوروں کا شکار کھیل چکا تھا مگر شیر کا شکار اس کی زندگی میں پہلا واقعہ تھا۔ رولینڈ منجھا ہوا شکاری تھا۔ اس نے فقط دل چسپی کی خاطر

لڑکوں کو اپنے ساتھ لے لیا تھا ورنہ اس کا خیال تھا کہ شیر کا شکار کرنے کی ہمّت فقط اسی میں ہے اور اسی لیے اس نے پہلی گولی خود چلانے کا پروگرام بنایا تھا۔

''چَپ چَپ۔ چَپ چَپ۔'' شیر کے چلنے سے آواز پیدا ہو رہی تھی۔

اتنے میں دور سے کسی اُلّو کے چیخنے کی آواز آئی۔ رضا اور فُرسان ایک دوسرے سے چمٹ کر زار و قطار رونے لگے۔ بکرا ابھی پوری طرح ممیا رہا تھا۔ شیر ندی کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے اگلے دونوں پاؤں جھکائے اور پانی پینے سے پہلے گردن گھُما کر پچھلی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں اس کا جسم صاحب دکھائی دے رہا تھا۔ شاہد اور رولینڈ درختوں کے پتوں میں چھپے اپنی بندوقوں کو کندھوں سے جوڑے پوزیشن بنا چکے تھے۔ شاہد بتّی جلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ شیر نے پانی نہیں پیا اور گردن گھما کر پوری طرح کھڑا ہو گیا۔ بکرا پھر ممیایا۔ شیر نے ایک لمبی سی جست لی اور بکرے پر سوار ہو گیا۔

''ڈز۔'' رولینڈ کی شاٹ گن چلی۔ بتّی جلی، اور ڈز ڈزر کی دوسری اور تیسری آواز

شاہد کی رائفل سے آئی۔

شیر گولی کھا کر ہوا میں کئی فٹ اونچا اچھلا اور پھر دھم سے زمین پر آن گرا۔ ڈز ڈز۔ شاہد اتنی دیر میں اس پر دو اور فائر کر چکا تھا۔ رولینڈ کی طرف سے اور کوئی گولی نہ چلی۔ شیر تیورا کے گرا اور پھر گھسٹتا ہوا ندی کی طرف بڑھنے لگا۔ ندی پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ گردن ڈال کر زمین پر گر گیا۔ گولیوں کی آوازوں سے ہزاروں پرندوں نے اپنے گھونسلے چھوڑ کر فضا میں اڑنا شروع کر دیا تھا اور ہر طرف قیامت کا شور مچا ہوا تھا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد سب لوگ درختوں سے اُترے۔ رضا اور فُرسان نے اپنے آپ کو رسّیوں سے مچان کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں سو گئے ہیں۔ عمّار اور شاہد نے انہیں آوازیں دیں اور بڑی مشکل سے انہیں درختوں سے اتارا اور مرے ہوئے شیر کی لاش دکھائی۔

زمین سُرخ ہو رہی تھی۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ شیر کے جسم میں چاروں

گولیاں شاہد کی رائفل کی لگی تھیں۔ قریب ہی بکرا مرا پڑا تھا۔ اسے رولینڈ کی گولی لگی تھی۔

"جب میں دوسری گولی چلانے لگا۔" رولینڈ نے کہا۔ "تو میری شاٹ گن جواب دے گئی۔ اگر تم نہ ہوتے تو یہ شیر ہرگز ہلاک نہ ہوتا۔ دراصل اس کا سہرا تمہارے سر ہے۔"

قاسم سے ملاقات

کھُلنا پہنچ کر رولینڈ اور گُن ڈھاکے جانے کی تیّاریوں میں مصروف ہو گئے۔ دوسرے دن عمّار کے نام بیرا ایک خط لے کر آیا۔ اس میں لکھا تھا:

”کھُلنا میں چاروں طرف جاسوس تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تم چاروں آج رات ہی میرے دوست غُلام رسول سے ملو۔ پہلے سے بنائے ہوئے پروگرام کے تحت میں تمہیں کلکتے میں گرینڈ ہوٹل میں ملوں گا۔ سرحد پار کرانے میں غُلام رسول تمہاری مدد کرے گا۔ اس کا پتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قاسم۔“

چاروں دوست غلام رسول سے ملے۔ غلام رسول چالیس پینتالیس سالہ مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس نے سیاہ عینک لگا رکھی تھی۔ اس کی ناک موٹی اور سر گنجا تھا۔

لڑکوں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولا۔ ”میں تمہارا منتظر ہی تھا۔ مجھے کلکتے سے قاسم صاحب کا رُقعہ ملا تھا جس میں انہوں نے تمہارے بارے میں مجھے ہدایات دی ہیں۔ میں نے تمہارے لیے پاسپورٹ تیار کروا دیے ہیں۔ آج رات بارہ بجے ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے تاکہ ہماری روانگی کا کسی کو پتا نہ چل سکے اور صبح کی روشنی سے پہلے کافی دور نکل جائیں۔ تم اسی کمرے میں آؤ میں تمہاری تصویریں لینا چاہتا ہوں۔“ غُلام رسول نے ان کی تصاویر اتاریں اور پاسپورٹ پر چسپاں کرنے لگا۔

شاہد واپس ہوٹل میں آیا اور ایک ٹیکسی میں سامان لاد کر پھر غُلام رسول کے ہاں پہنچ گیا۔ بارہ بجے تمام لوگ روانہ ہو گئے اور سرحد پر پہنچ کر پاسپورٹ دکھائے۔ سرحد پار کرنے کے بعد ایک جیپ میں عمّار کا ماموں انہیں ملا اور سلام دُعا اور تعارف ہونے کے بعد وہ انہیں کلکتے کی طرف لے کر چلا۔ ”آپ ہمیں پہلے کیوں

نہیں ملے ماموں؟" عمّار نے پوچھا۔

"بیٹے۔" قاسم نے جواب دیا۔ "تم لوگ نہیں جانتے کہ مجھ پر کتنی ذمہ داریاں ہیں۔ میں نے اپنے مختلف آدمی مختلف شہروں میں چھوڑ رکھے ہیں جو ایک ایک منٹ کی خبریں دیتے رہتے ہیں۔ تمہارے پیچھے چوں کہ بہرام جاسوس اور اس کا گروہ لگا ہوا ہے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ میں تمہارے ساتھ نہ رہوں بلکہ پوشیدہ رہ کر تمہیں ہدایات دیتا رہوں۔ ویسے تمہاری تسلّی کے لیے میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ جِس جِس شہر کا تم نے سفر کیا ہے ان تمام شہروں میں مَیں تمہارے پیچھے پیچھے ہوتا تھا۔"

یہ سن کر لڑکے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

"کیا آپ اس وقت بھی ہمارے قریب تھے جب کشتی میں ہماری لڑائی ہو رہی تھی؟" عمّار نے سوال کیا۔

"میں اکیلا ہی نہیں بلکہ غُلام رسول بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے سوچا کہ تم

چاروں ان جاسوسوں کو پچھاڑ سکتے ہو۔ اس لیے لڑائی میں دخل نہ دیا۔ جب تم تھک گئے تو میں نے رولینڈ کو تمہاری مدد کے لیے بھیجا۔ اس کے بعد سندر بن میں گئے تو مزدوروں کے ساتھ میرے آدمی بھی تھے اور ان میں غُلام رسول بھی تھا۔ یہ بہت قابلِ اعتماد آدمی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے تم کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ اس پر تم ویسے ہی اعتماد کر سکتے ہو جس طرح مجھ پر۔" غُلام رسول مُسکرایا اور شکریہ ادا کیا۔

"مگر ماموں۔" عمّار نے کہا۔ "شاہد کے ابّو اکرم صاحب کہاں ہیں؟"

"تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔ دراصل جس دِن تم چٹاگانگ پہنچے اس دن وہ وہیں تھے۔ پھر وہ تبّت کے شہر چونسی چلے گئے۔ وہ تمہیں وہیں مل سکیں گے۔ اس وقت وہ تبّت کے لاما کے پاس ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ "نورِلاما" نامی لعل لاما کو ملے تو وہاں سے واپس آئیں۔ اس مقصد کی خاطر میں نے سوچا ہے کہ ہم سیدھے سری نگر جائیں گے اور وہاں سے پیدل شہر چونسی روانہ ہوں گے۔ تمہارے ساتھ غُلام رسول بھی ہو گا اور میں بھی۔ ہندوستان کے راستے چونسی

پہنچنے کا راستہ ہم نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ بہرام اور اس کے جاسوس زیادہ تعداد میں سرحد پار نہیں کر سکیں گے۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ بہرام کو اب تک تمہارے بارے میں خبر مِل چکی ہو گی کہ تم لوگ کلکتہ پہنچ چکے ہو اور شاید وہ ہمارے پیچھے روانہ بھی ہو چکا ہو۔"

یہ سُن کر لڑکے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"گھبرانے کی بات نہیں" قاسم نے مسکرا کر کہا "ماشاء اللہ بہرام ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ماضی میں بھی اس نے ہم سے اور ہمارے گروہ سے کئی شکستیں کھائی ہیں۔ انشاء اللہ اس مرتبہ ایسی شکست کھائے گا کہ اس کی کمر ٹوٹ جائے گی۔"

یہ سن کر لڑکوں کو اطمینان ہوا۔ قاسم نے انہیں سمجھایا کہ گرینڈ ہوٹل میں پہنچ کر اوّل تو وہ باہر نہ نکلیں اور نکلیں بھی تو زیادہ دیر تک باہر نہ رہیں۔ اس کے بعد قاسم نے لڑکوں کو کچھ اور ہدایات دیں۔

آخر جیپ کلکتے کے گرینڈ ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ لڑکوں نے ہوٹل سے باہر نکلنے

کی کوشش ہی نہ کی۔ دوسرے دن کلکتے سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچ گئے۔

قاسم نے جب لڑکوں کو دہلی بھیجا تھا تو خود وہیں کسی کام سے رہ گیا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ صرف غُلام رسول آیا تھا۔ غُلام رسول نے سری نگر کا پتا دے دیا تھا اور کہا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے تم دہلی سے گاڑی کے ذریعے فوراً سری نگر پہنچنے کی کوشش کرنا۔ اگر مجھے کوئی کام پڑ گیا اور میں ایک دو دن دہلی میں رکا بھی رہا تو انتظار نہ کرنا، کیوں کہ بہرام جاسوس نہ صرف کلکتے پہنچ چکا ہے۔ بلکہ دہلی کی طرف بھی چل پڑا ہے۔

رات کو غُلام رسول ہوٹل میں نہیں آیا۔ لڑکے انتظار کرتے کرتے سو گئے۔ دوسری صبح بھی اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ چنانچہ چاروں دوستوں نے صبح کی پہلی ٹرین پکڑی اور چل پڑے۔

سری نگر میں

چندروز بعد لڑکے سری نگر پہنچ گئے ان دِنوں ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اتنے خراب نہیں تھے اور پاکستانیوں کو کشمیر جانے کی اجازت تھی۔ پہلے وہ سیدھے غُلام رسول کے مکان پر گئے مگر وہاں تالا لگا ہو تھا۔ مکان کیا تھا اُجاڑ اور غیر آباد جگہ میں ایک کمرے کا کوارٹر تھا۔ آس پاس کے لوگ فقط ایک بوڑھا بتا سکا کہ یہاں کوئی شخص غُلام رسول نامی رہتا ہے ورنہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ غُلام رسول کون ہے۔ انہوں نے سری نگر کی مشہور جھیل ڈل کے کنارے ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا اور خوب لمبی تان کر سوئے۔ وہ تقریباً ایک ہفتے تک

انتظار کرتے رہے مگر نہ تو غُلام رسول آیا اور نہ قاسم کا کوئی پیغام ملا۔

''بہتر ہے کہ ہم غُلام رسول کا انتظار کریں۔'' شاہد نے کہا اور سب لڑکوں نے ہاں کہی۔

چاروں دوست سری نگر کے کونے کونے میں پھر چُکے تھے۔ ان کو اُمّید تھی کہ شاید غُلام رسول کے بارے میں کچھ پتا چلے مگر انہیں اس کے سوا کچھ معلوم نہ ہوا کہ غُلام رسول، غُلام محمّد اور غُلام احمد نام کے بے شمار لوگ کشمیر میں رہتے ہیں۔

رات کا وقت تھا اور لڑکے اپنے بستروں میں گھس کر باتیں کر رہے تھے۔

فُرسان جوش سے بولا۔ ''میں بہت سے مُلکوں میں سیر و سیاحت کے لیے گیا ہوں مگر جو خُوب صورتی کشمیر میں دیکھی کہیں نظر نہ آئی۔ اسے اگر جنّت کہوں تو بالکل ٹھیک بات ہو گی۔''

شاہد مسکرایا اور بولا۔ ''ایک تُم ہی نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو کشمیر میں آیا اس نے کشمیر کو جنّت کہا۔ ایک مشہور ایرانی شاعر کا شعر ہے

اگر فردوس بروئے زمین است!

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یعنی اگر جنّت زمین پر ہے تو وہ جنّت یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے۔ شاعر کا ذکر آیا ہے تو تمہیں کشمیر کے بارے میں چند دل چسپ باتیں سناؤں۔ یہ تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ کشمیر پہاڑی علاقہ ہے اور یہاں ہر طرف سبزہ اور ہریالی ہے۔ اس کی خوب صورت جھیل ڈل میں شکارے چلتے ہیں، جن میں لوگ سیر کرتے ہیں۔ تم لوگوں نے کشمیر کے پانی کی یہ خوبی بھی دیکھ لی کہ ادھر چاول کی بڑی پلیٹ کھاؤ اور اُدھر پھر بھوک ستانے لگے۔ لیکن میں تمہیں کشمیر کے سب سے بڑے شاعر غنی کشمیری کا ایک واقعہ سناتا ہوں جسے علّامہ اقبالؒ نے بھی اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے۔

ہوا یوں کہ غنی کشمیری نے اپنے ایک شعر میں لفظ "کرال پَن" استعمال کیا۔ اس کی شہرت ایران تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ زیادہ تر فارسی میں شعر کہتا تھا۔ ایران

کے ایک مشہور شاعر نے جب لفظ ''کرال پَن'' پڑھا تو اس کا مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر پوچھا، کتابیں دیکھیں مگر کچھ پتا نہ چل سکا۔ آخر وہ غنی سے ملنے کشمیر آیا۔ غنی اس وقت گھر میں نہیں تھا لیکن اس کے گھر کے سب دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایرانی شاعر غنی کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ واپس گھر تو اس نے دروازے میں تالا لگا لیا۔ ایرانی شاعر بڑا حیران ہوا۔ کہنے لگا کہ جب گھر سے باہر تھے تو دروازے کھلے تھے۔ اب آ گئے تو دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ غنی مسکرایا اور کہنے لگا۔ اس گھر میں سب سے قیمتی چیز میرے سوا اور کیا ہے؟ جب میں باہر جاتا ہوں تو گویا سب سے قیمتی چیز بھی گھر سے باہر چلی گئی۔ اس لیے مجھے تالا لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ جب گھر میں داخل ہوتا ہوں تو پھر تالے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایرانی شاعر اس کے اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ پھر اس نے ''کرال پَن'' کا مطلب پوچھا۔ غنی نے کہا کہ یہ وہ دھاگہ ہے جو کمہار چلتی ہوئی چکّی پر برتن بنانے کے بعد برتن کو مٹی سے جدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اب میں تمھیں کشمیر کی دو خاص چیزوں

کے بارے میں بتاتا ہوں۔ کشمیر کی دو چیزیں بہت مشہور ہیں۔ دودھ کی روٹی اور زمین کی چوری۔"

"زمین کی چوری؟" رضا نے حیران ہو کر کہا۔ "میں آپ کی بات نہیں سمجھا"!

"بات یہ ہے" شاہد بولا۔ "کشمیر کے لوگ دودھ کو خشک کر کے یا پنیر وغیرہ بنا کے روٹی تیار کرتے ہیں۔ چوں کہ سری نگر میں ہر جگہ پانی ہے اس لیے لیے کشمیری لکڑی کے تختوں گھاس پھونس اور مٹّی بچھا کر مصنوعی زمین تیار کرتے ہیں اور زمین کے ان ٹکڑوں کو جھیل میں کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ زمین کے ان چلتے پھرتے ٹکڑوں پر سبزیاں اور غلّہ ہوتے ہیں۔ گویا یہ ان لوگوں کی تیرتی کھیتیاں ہیں۔ چور ان زمینوں کو چُرا بھی لے جاتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ کشمیر میں دودھ کی روٹی اور زمین چوری مشہور چیزیں ہیں۔"

رضا اور فُرسان مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔

"میں نے اپنے ابّو سے سنا ہے۔" شاہد بولا۔ "کشمیر میں کسی جگہ ساتھ ساتھ دو

چشمے ہیں۔ ایک کا پانی اس قدر گرم ہے کہ لوگ اس میں چاول اُبال لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس قدر ٹھنڈا چشمہ ہے کہ ہاتھ ڈالیں تو سُن ہو جائے۔"

"میرا خیال ہے۔" فُرسان بولا۔ "کہ کشمیریوں سے زیادہ حسین لوگ دنیا میں شاید ہی کہیں ہوں۔ لیکن ان کی غربت اور بھارت کا ان پر ظلم دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ خیر، انشاء اللہ یہ ایک دن پاکستان میں شامل ہوں گے اور ان کے سارے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔"

"انشاء اللہ۔" شاہد بولا۔ "کشمیریوں کے بارے میں تمہیں ایک بات اور بتاؤں۔ یہ لوگ کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں۔ ان جیسا لذیذ کھانا شاید ہی کوئی اور قوم تیّار کرتی ہے۔ مشہور ہے کہ کشمیری جتنا کماتے ہیں سب کھانے پینے پر خرچ کر دیتے ہیں۔ ان کی مہمان نوازی بھی عربوں کی طرح مشہور ہے۔ یہ لوگ مہمان کو حیلوں بہانوں سے کھلاتے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ ان کی چالوں سے واقف نہیں وہ پھنس جاتے ہیں اور یہ انہیں اتنا کھلا دیتے ہیں کہ بے چاروں کو سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ یہی ہتھکنڈا میرے ساتھ پاکستان میں ایک کشمیری

خاندان نے کیا تھا۔ یقین جانو میرا پیٹ پھٹنے کے قریب ہو گیا تھا۔ ان کے دو سالن مجھے بہت ہی پسند آئے۔ ایک کا نام گُشتابہ ہے اور دوسرے کو شب دیگ کہتے ہیں۔ یہ لوگ قیمے کو سِل پر اتنا پیستے ہیں کہ سرمہ بن جاتا ہے۔ پھر اس میں مختلف مسالے مِلا کر اور کوفتوں کی طرح گول کر کے ابال لیتے ہیں۔ اسے گشتابہ کہتے ہیں۔ ایسا لذیذ سالن میں نے کبھی نہیں کھایا۔ شلجم پکانے میں یہ لوگ بڑے ماہر ہیں۔ چاولوں کے ساتھ جنہیں یہ لوگ بتّہ کہتے ہیں۔ شلجم کھانا ایک قسم کی عیاشی ہے۔"

وہ دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے اور پھر سو گئے۔ دوسرے دن صبح وہ ناشتا کر رہے تھے، کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ کھانے کے ساتھ ساتھ وہ ڈل جھیل کا نظّارہ بھی کر رہے تھے کہ اتنے میں رضا نے ایک چھوٹی سی کشتی دیکھی جس میں ایک آدمی سیاہ عینک لگائے بیٹھا تھا۔

"خُدا جھوٹ نہ بلوائے۔" رضا بولا۔ "یہ تو غُلام رسول صاحب ہیں۔"

رضا کی بات سن کر باقی لڑکے بھی اسی طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں کشتی کنارے پر آ کر لگ گئی اور اب جو لڑکوں نے غور سے دیکھا تو وہ غُلام رسول ہی تھا۔ لڑکے جلدی سے اٹھے اور کنارے پر جا کر اسے خوش آمدید کہنے لگے۔

غُلام رسول کا گلا خراب تھا اور آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔" غُلام رسول نے کھانستے ہوئے بھاری آواز میں کہا۔ "میں وقت پر تمہیں مل نہیں سکا۔ دراصل میں بیمار ہو گیا تھا اور میرا ایک دوست مجھے اپنے گھر لے گیا تھا۔ جب میں ہوٹل میں پہنچا تو پتا چلا کہ تم دہلی سے جا چکے ہو۔ چنانچہ میں دوست کے ہاں ہی علاج کراتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب ہمیں آج بارہ بجے ہی یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ میں کل ہی یہاں پہنچا ہوں۔ بڑی مشکل سے تمہارا پتا معلوم ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم میرے گھر آئے مگر میں تمہیں نہ مل سکا۔ یہ خط مجھے مسٹر قاسم نے دیا ہے۔"

عمّار نے خط لیا اور اونچی آواز میں پڑھنے لگا۔

”شاہد بیٹے!

میں نے سوچا تھا کہ تم لوگوں کے ساتھ چونسی جاؤں اور لاما کو لعل پیش کرنے کا نظّارہ خود دیکھوں مگر قدرت کو یہ منظور نہیں۔ غُلام رسول چونسی کا راستہ مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اس لیے میری جگہ وہ تمہارے ساتھ جائے گا۔ تم اس کی ہدایات پر عمل کرنا۔ چونسی پہنچ کر خان صاحب سے میر اسلام کہنا نہ بھولنا۔

قاسم“

لڑکوں نے جلدی جلدی تیّاری شروع کر دی۔ بہت سا سامان خریدا اور کچھ خوراک کے ڈبّے بھی ساتھ لیے۔ تقریباً پانچ سو میل کا سفر تھا۔ اس لیے انہوں نے چند ایسے قُلیوں کا انتظام کیا جو خوراک اور سامان اٹھا سکیں۔ اب لڑکوں کے ساتھ غُلام رسول اور غُلام رسول کے پائلٹ دوست کا قافلہ لیہہ جانے لیے تیار تھا۔ لیہہ سری نگر سے ۵۰۰ میل دور ہے۔ وہاں جانے کے لیے غلام رسول نے جہاز کا انتظام کر رکھا تھا۔ جہاز پورے سات بجے اڑا۔ چار پانچ گھنٹوں کے بعد وہ

لیہہ میں موجود تھے۔ لیہہ پہنچ کر لڑکوں نے شہر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ غُلام رسول پہلے تو نہ مانا مگر بعد میں انہیں اجازت دے دی اور کہا کہ جلد ہی شہر سے لوٹ آئیں کیوں کہ ابھی سفر باقی ہے۔ لڑکے شہر میں داخل ہوئے۔ وہاں انہوں نے بازاروں میں دیکھا کہ دکانوں پر بہت بھیڑ ہے۔ بازاروں میں مختلف نسل کے لوگ پھر رہے ہیں کیوں کہ یہ ایک تجارتی مرکز ہے۔ جہاں مختلف کاروان سامان خریدنے اور بیچنے آئے ہیں۔ تھوڑی دیر سیر کرنے کے بعد لڑکے واپس اسی جگہ آئے جہاں جہاز کھڑا تھا۔ لڑکوں کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ جہاز کے کسی پرزے میں ایسی خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ جب تک پورا انجن نہ کھولا جائے گا اس وقت تک اڑانا خطرناک بات ہو گی۔

"اب کیا کِیا جائے؟" لڑکوں نے مایوس ہو کر سلام کیا۔

تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد پروگرام یہ بنا کہ لیہہ سے چونسی تک پیدل جایا جائے۔ سامان اٹھانے کے لیے غُلام رسول نے چار قُلیوں کا انتظام کر لیا۔ پائلٹ کو پیچھے چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ جہاز کی مرمّت کر سکے۔

برفانی آدمی

ان کے سامنے برف میں سے گزرتا ہوا ایک راستہ تھا۔ سب لوگ اس پر چل پڑے۔ شاہد سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ لاما کے سامنے پیش ہو گا اور اپنے ابّو کو دوبارہ دیکھ سکے گا۔ اس چیز کا تصوّر کرتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس سے کچھ دُور عمّار تھا اور عمّار کے پیچھے رضا اور فُرسان کسی بات پر بحث کرتے ہوئے جا رہے تھے۔

ہر طرف برف ہی برف تھی۔ سردی سے دانت بج رہے تھے۔

"یے ٹی۔" اچانک ایک مزدور چلایا اور بھاگ کر لڑکوں کے پاس آیا۔

"یے ٹی؟" شاہد نے لفظ دہرایا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

اس سے پہلے کہ شاہد کو جواب ملتا۔ یے ٹی کا لفظ سن کر دوسرے مزدوروں کے چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا اور وہ لڑکوں کے قریب ہو گئے۔

"کیا ہے؟ کہاں ہے؟" عمّار نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"یے ٹی۔ دراصل برفانی انسان کو کہتے ہیں۔" غُلام رسول کہنے لگا۔

"برفانی آدمی؟ کیا مطلب؟" شاہد نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا خیال تھا کہ برفانی آدمی لوگوں کا گھڑا قصّہ ہے مگر حیرت ہے کہ برف پر یہ بڑے بڑے پاؤں کے نشان جو انسان کے پاؤں کے نشان معلوم ہوتے ہیں کہاں سے آ گئے؟ اور نشان تو ابھی بالکل تازہ ہیں۔ کشمیر، سِکّم، بھوٹان، نیپال، تبّت، لدّاخ حتیٰ کہ یار قند میں بھی لفظ "یے ٹی" مشہور ہے۔ ان علاقوں کے رہنے

والوں کا خیال ہے کہ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں میں برفانی انسان رہتا ہے۔ اس کا قد ہاتھی سے بڑا اور پاؤں کے نشان چکّی کے پاٹ بنے ہوتے ہیں۔ اگر برفانی آدمی یُونہی اُڑی ہوئی افواہ ہے تو یہ نشان کس چیز کے ہیں؟" رضا اور فُرسان بھی ڈر کے لوگوں کے بیچ میں آ گئے۔

شاہد اور عمّار نے برفانی آدمی کے پاؤں کے نشانات کی طرف چلنا شروع کیا لیکن تھوڑی دور جا کر وہ غائب ہو گئے۔ اس لیے دونوں لڑکے واپس آ گئے۔

قافلہ پھر آگے چل پڑا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا نالا پڑتا تھا۔ انہوں نے اسے عُبور کیا۔ اس کے آگے ایک تیز رفتار ندّی بہتی تھی جس پر کوئی پُل نہیں تھا۔ اسے کیسے عبور کیا جائے؟" یہ سوال ہر ایک کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔

"ٹھہرو۔" عمّار بولا۔ "وہ کلہاڑی کہاں ہے جو ہم نے سری نگر سے خریدی تھی؟"

ایک مزدُور نے سامان میں سے کلہاڑی نکال کر عمّار کو دی۔ عمّار ذرا فاصلے پر جا کر ایک لمبے اور پتلے درخت کے تنے پر ضربیں لگانے لگا۔ لگاتار ضربوں سے

درخت ندی کی جانب گرا۔ اب اس کا ایک سرا ایک کنارے پر اور دوسرا سرا دوسرے کنارے پر یوں پڑا تھا کہ درخت ایک پُل کا کام دے رہا تھا۔ عمّار نے ایک مضبوط سی رسّی لے کر قریب کے ایک درخت کے تنے کے ساتھ مضبوطی سے لپیٹی اور دوسرا سرا پُل پر سے گزار کر دوسرے کنارے پر اُگے ہوئے درخت کے تنے میں باندھ دیا۔

تمام لوگ عمّار کی چستی اور ہوشیاری سے بہت خوش ہوئے اور رسّی کو تھامے ہوئے پُل پر سے بحفاظت گزر گئے۔

"اس ندّی کا پانی اتنا تیز رفتار ہے کہ اگر خُدا نخواستہ کوئی گر جاتا تو پانی اسے بہا لے جاتا اور ندی کے پتھّروں سے ٹکرا کر اس کا جسم دیکھتے ہی دیکھتے قیمہ بن جاتا۔ شکریہ عمّار ترکیب سے یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔" شاہد کہہ رہا تھا۔ قافلہ راستے میں تھوڑی دیر کے لیے رُکتا اور کھانا وغیرہ کھا کر پھر چل پڑتا۔ آج انہیں تیسرا روز تھا چلتے ہوئے۔ اچانک سرد ہوا چلنے لگی۔ فوراً خیمے گاڑھ دیے گئے اور تمام سامان خیموں کے اندر رکھ دیا گیا۔ ہوا تیز ہو گئی تھی۔ خیمے کو اچھی طرح ہر

طرف سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ باہر شوں شوں شرررشررر کی آوازیں اور آندھی کی چیخوں سے طوفان برپا تھا۔ فُرسان اور رضا میں پھر نوک جھونک کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ نتیجے میں قہقہے لگ رہے تھے۔ اور باہر طوفان زوروں پر تھا۔

تھوڑی دیر بعد طوفان ختم ہو گیا اور سب خیمے سے باہر نکلے۔ سفر پھر شروع ہو گیا۔ ہر طرف برف ہی برف تھی۔ راستے میں مختلف شکلوں کی چٹانیں آئیں۔ اونچے نیچے برف کے تودے اور بے شمار چھوٹے چھوٹے ندی نالے آئے۔ اچانک برف باری شروع ہو گئی۔ خیمے پھر گاڑ دیے گئے۔ کافی کا دور پھر چلا۔ عمّار اور شاہد خیموں سے باہر نکل کر برف باری کا نظّارہ کرنے لگے۔ باقی لوگ اندر تھے۔ عمّار نے ہاتھوں میں کلہاڑی پکڑ رکھی تھی اور شاہد گرتی ہوئی برف میں اس کی تصویریں لے رہا تھا۔ اس کے بعد عمّار نے شاہد کی تصویریں اتاریں۔

"شاہد۔" اچانک عمّار بوکھلا کر بولا۔ "یہ یے ٹی کے ہیں۔"

شاہد بھی حیران ہو کر ان نشانات کو دیکھنے لگا۔ "بالکل انسان کے پاؤں کے نشانات

لگتے تھے۔" شاہد نے کہا۔ "کیوں نہ ان کا پیچھا کیا جائے۔"

"لیکن دوسرے لوگوں کو خبر تو کر دیں۔" عمّار نے کہا۔

"میرے خیال میں ہم اگر انہیں اطلاع نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ ویسے میرا دل نہیں مانتا کہ یے ٹی بھی کوئی چیز ہے۔ چلو چلیں۔" شاہد نے کہا۔ اور دونوں نشانات کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ چلنے سے پہلے شاہد نے خیمے کے باہر گڑا ہوا نیزہ ہاتھ میں لے لیا۔ عمّار کے پاس کلہاڑی تھی۔ نشانات برف کے ایک تودے تک چلے گئے تھے۔ لڑکے بھی تودے پر چڑھ گئے۔ نشانات اب ایک چھوٹی سی غار یا گڑھے میں جاتے تھے۔ لڑکے وہاں پہنچ گئے۔

"ٹھہرو۔" عمّار اچانک بولا۔ "وہ دیکھو کیا ہے؟"

شاہد نے دیکھا کہ ایک بڑی سی انسانی شکل کی چیز جس کا سر کالا تھا، برف میں بیٹھی ہوئی تھی۔ عمّار اور شاہد کو دیکھ کر اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

"بھاگو تیزی سے۔" شاہد نیزہ لیے اس کی طرف لپکا۔ عمّار بھی اس کے اس کے

پیچھے تھا۔ وہ چیز وہاں سے نکل کر ایک اور گڑھے میں جا بیٹھی۔ اس کے جسم پر برف کے گالے پڑے ہوئے تھے۔ لڑکے اس کے قریب پہنچے تو وہ وہاں سے بھاگ کر برف کے ایک بہت بڑے تودے کی طرف بڑھی اور چڑھنے لگی۔ شاہد اور عمّار بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

چڑھائی چڑھتے ہوئے انہوں نے اچانک ایک غار دیکھا۔

”میرے خیال میں وہ اس غار میں گیا ہے۔“ شاہد بولا۔

عمّار نے شاہد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بائیں طرف اُوپر دیکھو۔“

عمّار کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ اس کے سامنے ذرا فاصلے پر ایک بہت بڑا تبّتی ریچھ کھڑا تھا، خطرناک، تبّتی ریچھ جو شکار کیے بغیر شاید ہی واپس گھر لوٹتا ہے۔ برفانی پہاڑوں میں رہنے والی سب سے خطرناک مخلوق۔

”عمّار۔“ شاہد جوش سے بولا۔ ”اسے ختم کیے بغیر ہم سلامت واپس نہیں جا سکتے۔ تیّار ہو جاؤ۔“

اچانک نچلی طرف سے آواز گونجی۔ ''شاہد، عمّار۔''

سامنے ریچھ غرّا رہا تھا۔ عمّار اور شاہد آہستہ آہستہ بائیں طرف ہٹنے لگے۔ ریچھ بھی ان کی طرف بڑھنے لگا۔ شاہد نے نیزے کی انّی اُس پیٹ کی طرف بڑھانا شروع کی۔ اچانک پیچھے سے پھر ''شاہد'' کی آواز آئی۔

''میرے خیال میں غُلام رسول اور دوسرے لوگ آرہے ہیں۔ انتظار کیا جائے تو بہتر ہے۔'' عمّار نے کہا۔

شاہد کا نیزہ وہیں رُک گیا۔ ریچھ کی غرّاہٹ تیز ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا اگلا پنجہ اُٹھا کر نیزے کو چھوا۔ پھر بار بار زمین پر پنجے مارنے لگا۔

جب مزدوروں اور خیمے میں موجود دوسرے لوگوں نے دیکھا کہ دونوں لڑکے غائب ہیں تو انہیں فکر ہوئی اور غُلام رسول رائفل اور مزدوروں میں سے ایک مزدور تیر کمان لے کر شاہد اور عمّار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ خوش قسمتی سے وہ اسی طرف چلنے لگے۔ جِدھر شاہِد اور عمّار پاؤں کے نشانات دیکھ کر

چلے تھے۔ اب وہ کافی قریب آ چکے تھے۔

اچانک ریچھ غرّایا اور اس نے عمّار پر چھلانگ لگائی۔ عمّار اِنتہائی پھُرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ریچھ زمین پر ِگرا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شاہد نے نیزہ ریچھ کے پیٹ میں دے مارا۔ اسی لمحے عمّار کی کلہاڑی اس کے سر پر پڑی۔ اسی وقت ذرا وقفے سے دو گولیاں یکّے بعد دیگرے چلنے کی آواز آئی اور مزدور کا تیر بھی عین نشانے پر جا کر لگا۔ ریچھ تلملایا، اُچھلا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

غُلام رسول، فُرسان، رضا اور مزدور سب بھاگتے ہوئے ریچھ کے پاس آئے۔ اس کی لاش کو پچھلی ٹانگوں سے کھیلتے ہوئے دو مزدور خیمے تک اُٹھالائے۔ راستے میں سب لوگ بحث کر رہے تھے کہ کِس کے ہتھیار سے ریچھ مرا ہے۔ شاہد کا خیال تھا کہ سب سے پہلے اس نے نیزہ مارا ہے۔ عمّار کا کہنا تھا کہ اس کی کلہاڑی ریچھ کی ہڈیاں توڑتی ہوئی اس کے جسم میں داخل ہوئی تھی۔ مزدور کہتا تھا کہ اس کا تیر سب سے پہلے لگا ہے۔ غُلام رسول مسکرا کر بولا۔ ”میرے خیال میں گولی نے اس کا کام تمام کیا ہے۔ مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ میں نے تو ایک

گولی چلائی تھی۔ ریچھ کے دو گولیاں کیسے لگیں۔"

"یہی ہے وہ برفانی آدمی۔ جسے یہاں کے لوگ برفانی بلا سمجھ کر خواہ مخواہ خوف و ہراس پھیلاتے ہیں۔" شاہد نے کہا۔ "آج برفانی آدمی کا راز بھی فاش ہو گیا۔"

مزدوروں کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ برفانی آدمی دراصل یہ تبّتی ریچھ ہی ہے۔

خیمے میں پہنچ کر مزدوروں نے ریچھ کی کھال اُتاری اور گوشت محفوظ کرنے لگے۔ ان کے لیے اتنی مقدار میں گوشت بہت بڑی نعمت تھی۔ ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔

پھر خیمے اُکھاڑے گئے، سامان باندھا گیا، اور قافلہ چل پڑا۔ برف، برف، ہر طرف برف۔ رات دن برف پر سفر کرتے کرتے سب اُکتا چکے تھے۔ دھوپ کے لیے ترستے تھے۔ مگر سُورج نکلنے کا نام نہ لیتا تھا۔

اب ان لوگوں نے خیمہ گاڑ رکھا تھا اور باتیں کر رہے تھے۔ غُلام رسول نے ایک

صندوق میں سے دور بین نکالی اور شمال کی جانب دیکھنے لگا۔ دور دور تک سوائے برف کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے ایک نقشہ نکالا اور قُطب نُما کی سوئیوں کی مدد سے اندازہ کرنے لگا کہ اس وقت وہ کہاں ہیں۔

"اگر قطب نما کی سوئیوں کو بھی سردی نہیں لگ گئی تو میرے اندازے کے مطابق ہم چونسی شہر سے تقریباً ایک سو میل دور کھڑے ہیں۔"

غُلام رسول مسکرا کر بولا۔ پھر نقشے پر جھک کر وہ راستہ بتانے لگا۔ شاہد نے دور بین اُٹھائی اور اسی طرف منہ کر کے دیکھنے لگا۔ جس طرف غلام رسول نے دیکھا تھا۔

"اب مجھے دیکھنے دو۔" رضا نے دور بین کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ذرا ٹھہرو۔" شاہد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ کیا ہے؟ ذرا آپ بھی دیکھیں۔ ایک سیاہ دھبّا سا نظر آرہا ہے۔ یے ٹی تو نہیں؟"

"یے ٹی اب کہاں؟" غُلام رسول نے دُور بین آنکھوں کو لگائی۔ "سیاہ دھبّا قریب آتا جا رہا ہے اور اس کا رُخ بھی ہماری طرف ہی ہے۔" غُلام رسول

بڑبڑایا۔ دوربین لے کر باری باری سب لڑکوں نے اس طرف دیکھا۔ دھبّا اب بہت بڑا ہو گیا تھا۔ یہ ایک گھڑ سوار تھا جو پوری تیزی سے ان کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

"شہر چونسی بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔" عمّار بولا۔

"نہیں۔" غُلام رسول بولا۔ "اس سِمت میں نہیں ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد گھڑ سوار ان کے خیمے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ گھوڑے سے اترا جھک کر سب کو سلام کیا اور ایک بڑا سا کاغذ جو رول کیا ہوا تھا، شاہد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر گھوڑے کی پیٹھ پر اُچھل کر بیٹھا اور مُسکراتا ہوا یہ جا وہ جا۔ دراصل وہ انہیں ایک نقشہ دے گیا تھا۔

"عجب انسان ہے یہ۔" شاہد بڑبڑایا۔

پھر وہ نقشے کو خیمے کے اندر لے گئے اور زمین پر پھیلا کر چونسی کا راستہ ڈھونڈنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں غُلام رسول نے سُرخ پنسل سے ایک کاغذ پر چند نشان

لگائے اور ٹیڑھا میڑھا راستہ کھینچ دیا۔

"ہم چونسی سے تقریباً ساٹھ میل دُور رہ گئے ہیں۔" غُلام رسول بولا۔ "اگر راستے میں ٹھہرنے کی کوشش نہ کریں تو آج رات یا کل صُبح وہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

یہ سُن کر سب کے چہروں پر اِطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ خیمہ اکھاڑ کر سب چل پڑے ان کی رفتار میں تیزی پیدا ہو چکی تھی۔

راستے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا سوائے اس کے کہ ایک جگہ انہوں نے جمی ہوئی آبشار دیکھی۔ سردی کی وجہ سے اس کا پانی جم چکا تھا اور دُور سے سفید ریشم کی چادر معلوم ہوتی تھی۔ اس پر سے گزرتے ہوئے انہیں بہت ہوشیاری اور احتیاط سے کام لینا پڑا۔ ورنہ خطرہ تھا کہ اگر ذرا سا بھی کسی کا پیر پھسل جاتا تو وہ سینکڑوں فٹ نیچے جا گِرتا۔ فُرسان نے جونہی ایک چھوٹا سا پتّھر اُٹھا کر آبشار کے نیچے پھینکا۔ پتّھر تقریباً ایک منٹ تک زمین پر نہ لگا۔ پھر اس کے گِرنے کی آواز آئی۔ "دھم" اِرد گِرد کی پہاڑیوں سے بھی آوازیں آنے لگیں۔ "دھم۔ دھم۔

دھم“

”اِسے بازگشت یا گونج کہتے ہیں۔“ شاہد نے رضا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لو دیکھو۔“ شاہد پھر بولا اور زور سے چیخ کر بولا۔ ”عمّار“

تھوڑی دیر بعد آس پاس کی پہاڑیوں میں ”عمّار عمّار عمّار عمّار۔“ کی آوازیں گونجنے لگیں۔

”لو اب تمہیں اور تماشا دکھاؤں۔ دل مضبوط کر لو رضا۔“ شاہد نے اِتنا کہا اور قہقہے لگانے لگا۔ ”ہاہاہاہاہا“ ہاہا کی بازگشت سے اِرد گرد کی تمام پہاڑیاں یُوں گُونجنے لگیں جیسے سینکڑوں دیو اور جِن قہقہے لگا رہے ہوں۔ فُرسان اور رضا کے چہرے اڑنے لگیں۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر اسے چُپ ہونے کو کہہ رہے تھے۔ آخر عمّار کے کہنے پر شاہد چُپ ہو گیا۔

بہرام جاسوس

آخر برف کا سفر ختم ہوا اور انہوں نے پہاڑ کی بلندی سے وادی کی طرف دیکھا۔

"وہ دیکھو، اس وادی میں شہر چونسی نظر آرہا ہے۔" غُلام رسول نے لڑکوں سے کہا۔

اور وہ بُلندی سے اسے دیکھنے لگے۔ منزل کو سامنے دیکھ کر سب کے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھانے لگے۔ شاہد اپنے باپ سے ملنے کی خوشی میں تقریباً بھاگ رہا تھا۔

آخر وہ چلتے چلتے ایک بہت بڑی دیوار کے قریب پہنچے۔ یہاں اِستقبال کرنے کے لیے بے شمار لوگ جمع تھے جن میں چھوٹے لاما بھی تھے۔ انہوں نے لوگوں کو پرے ہٹایا، مزدوروں کو اُجرت دے کر فارغ کیا اور پانچویں آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے۔

چلتے چلتے وہ ایک بہت بڑی قلعہ نما عمارت کے دروازے میں داخل ہوئے۔ وہاں جگہ جگہ آدمی پہرے پر کھڑے تھے۔ پانچوں آدمیوں کو مختلف راستوں اور کمروں میں سے گزار کر چھوٹے لاما انہیں ایک کمرے میں لے گئے اور کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھ گئے تو ایک چھوٹا لاما ٹوٹی پھوٹی اُردُو میں انہیں سمجھانے لگا کہ تمہیں اب سب سے بڑے لاما کے سامنے جانا ہے۔ اس لیے نہایت ادب کرنا اور زیادہ تر خاموش رہنے کی کوشش کرنا۔ بڑے لاما کو دیکھنے کا شرف بیسیوں سال کے بعد کہیں کسی خوش نصیب کو حاصل ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔"

ان کے پہنچنے کی اطلاع چونسی لاما کو دے دی گئی تھی۔ اس کا محل بے حد

خُوبصورت تھا۔ چاندی کے دروازے لگے ہوئے تھے اور دیواروں پر پھولوں اور بیلوں کی تصویریں کھدی ہوئی تھیں۔ پتّوں کی جگہ زمُرّد اور پھولوں کی جگہ نگینے جڑے ہوئے تھے۔ اس قدر قیمتی محل دنیا میں کسی بادشاہ کے پاس نہ ہو گا۔ ادب کا یہ عالم تھا کہ بات کرنا تو کیا کسی پرندے تک کو وہاں پَر مارنے کی اجازت نہ تھی۔

تھوڑی دیر بعد دو آدمی آئے۔ انہوں نے شاہد کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔

"تم"

اور شاہد ان کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سنگِ مرمر کی سیڑھیوں پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے اور دیواروں پر سونے اور چاندی کے مور، ہرن، شیر اور دوسرے جانوروں کی تصاویر کھدی ہوئی تھیں۔ شاہد ہر لمحے حیرت میں ڈوبتا جاتا تھا۔

مختلف راستوں کے چکّر دیتے ہوئے دونوں آدمی اسے ایک تاریک سے ہال میں لے گئے۔ ہال کے اندر فانوس کی روشنی تھی۔ سامنے ایک بیش قیمت تخت بچھا ہوا

تھا۔ جس پر چونسی لاما سفید ریشمی کپڑے پہنے اور سر پر ہیروں جڑا تاج رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں دو وزیر کھڑے تھے۔

کمرے میں داخل ہو کر شاہد نے ہاتھ پیشانی تک لے جا کر لاما کو سلام کیا۔ لاما نے ہاتھ بلند کر کے جواب دیا اور شاہد کی طرف لعل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شاہد نے جیب سے لعل نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھا اور پھر واپس اپنی جگہ پر جا کھڑا ہوا۔

چونسی لاما ہیرے کو دیکھ کر مسکرایا۔ ''کیسا بے ہودہ انسان ہے۔ شکریہ تک ادا نہیں کیا۔'' شاہد کے دل میں خیال گزرا۔

دونوں محافظوں نے شاہد کو اس جگہ سے ہٹا کر بائیں طرف کھڑا کر دیا۔

چونسی لامانے دو مرتبہ تالی بجائی تو ایک محافظ اکرم خان کو لے کر کمرے میں آیا۔ شاہد آگے بڑھ کر گلے ملنے لگا تو اکرم نے ہاتھ کے اشارے سے وہیں کھڑا رہنے کے لیے کہا۔

اس کے بعد وہی دونوں محافظ گئے اور رضا، فُرسان اور عمّار کو لے آئے۔ وہ بھی سلام کرنے کے بعد شاہد کے قریب کھڑے ہو گئے۔ پھر غُلام رسول خان کو بُلایا گیا۔ وہ بھی ہال میں داخل ہوا اور چونسی لاما کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے آنکھوں سے عینک اتاری اور سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

"لیکن۔ لیکن یہ غُلام رسول تو نہیں ہے۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں۔" اکرم خان بول پڑے۔

"ہاں میں غُلام رسول نہیں ہوں۔ میرا نام بہرام ہے۔ غُلام رسول اور قاسم دونوں کو میں نے دہلی اور کلکتے میں گرفتار کر لیا تھا۔ میرے جاسوس اس وقت محل کے نیچے اور اس کمرے میں موجود ہیں۔ میں چونسی کا ہیرا ہی نہیں لینا چاہتا بلکہ وہ تمام ہیرے جو یہاں ہندوستان کے راجا نے بھیجے تھے اور وہ تمام چاندی اور سونا جو گزشتہ کئی صدیوں سے یہاں جمع ہوتا آرہا ہے اب میرے ہوں گے۔ میں یہاں غُلام رسول کے بھیس میں سری نگر سے آیا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ چونسی لاما تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اس لیے میری ترکیب یہی تھی کہ میں شاہد کے ساتھ

غُلام رسول بن کر یہاں داخل ہوں۔ خبردار، کوئی ایک قدم بھی نہ ہلے ورنہ میرے پستول کی گولیاں تم سب کا جسم چھلنی کر دیں گی۔"

"ادھر لاؤ چابی۔" بہرام خان گرج رہا تھا۔ لڑکے حیرت سے اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

چونسی لاما بالکل نہ گھبرایا۔ اس نے اپنے خزانے کی چابیاں بہرام کو پکڑا دیں۔

"جاؤ اور سکندر اور پرویز کو نیچے سے بلا لاؤ۔" بہرام نے اس محافظ کو اشارہ کیا جو اکرام خان کو لے کر ہال میں آیا تھا۔ چونسی لاما اور اس کے وزیر حیرت سے محافظ کو جاتا دیکھ رہے تھے۔ اتنے دلیر اور جان پر کھیل جانے والے جاسوس کا کوئی تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہی محافظ سکندر اور پرویز کو لے کر ہال میں داخل ہوا۔

"لو یہ چابیاں سنبھالو سکندر۔" بہرام نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

سکندر آگے بڑھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے چابیاں لیں اور دوسرے سے اس نے بہرام کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ پستول دور جا گرا۔ پرویز آگے بڑھا اور اس نے بہرام کو پیچھے سے جا پکڑا۔ سکندر پستول پکڑ کر بہرام کی طرف رُخ کر کے کہنے لگا۔

"خبردار۔ ہلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ابھی تمہاری لاش یہاں پھڑکتی ہوئی نظر آئے گی۔" اتنا کہہ کر پرویز اور سکندر دونوں نے چہروں سے نقاب ہٹا دیے۔

"کون قاسم ماموں؟" عمّار حیرت سے بولا۔

"اور غُلام رسول۔" شاہد حیرت سے بولا۔ "بات یہ ہوئی تھی کہ بہرام نے مجھے اور قاسم صاحب دونوں کو گرفتار تو کر لیا لیکن ہماری حفاظت کا بندوبست نہ کر سکے۔ انہوں نے ہمیں دو لڑکوں کے سپرد کر دیا۔ ہم نے انہیں رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور بہرام اور اس کے ساتھیوں کا سارا پروگرام معلوم کر لیا۔ اس کے بعد ہم نے بہرام کو گرفتار کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ ہم بھیس بدل کر بہرام

کے ساتھیوں میں شامل ہو گئے اور یہاں تک پہنچ گئے۔ اس خوف ناک ریچھ کو مارنے والا نہ شاہد ہے نہ عمّار اور نہ مزدور۔ سب سے پہلے اسے قاسم صاحب کی گولی لگی تھی۔"

"گرفتار کر لو انہیں۔" چونسی لاما نے محافظوں سے کہا اور انہوں نے آگے بڑھ کر بہرام کو جکڑ لیا۔ اکرم خان کے محافظ نے بھاگنے کی کوشش کی تو غلام رسول نے پستول تان کر پیچھے سے آواز دی۔ "اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو گولی تمہارے جسم کے پار ہو جائے گی۔ تمہارے سب ساتھ گرفتار ہو چکے ہیں۔"

"ہم سری نگر سے ہی بہرام کے آدمیوں کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے تھے۔" قاسم نے اکرم خان کو ہنستے ہوئے بتایا۔

رات کو لڑکے، اکرم خان، قاسم اور غُلام رسول چونسی لاما کے محل میں دعوت پر ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

"اب میں ان بدمعاشوں کو خُونی جیل کی ساتویں کوٹھری کے کنویں میں رکھوں گا

اور یہ تمام عمر وہیں گزار دیں گے۔" چونسی لاما مُسکرا کر بولے۔

"میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ کی امانت آپ تک پہنچ گئی۔" اکرم خان نے مسکرا کر کہا۔

ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد یہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے اور چند روز بعد ڈھاکہ میں شاہد کی امّی اور ماموں کے پاس بیٹھے مُسکرا مُسکرا کر اپنی مُہم کے واقعات سنا رہے تھے۔